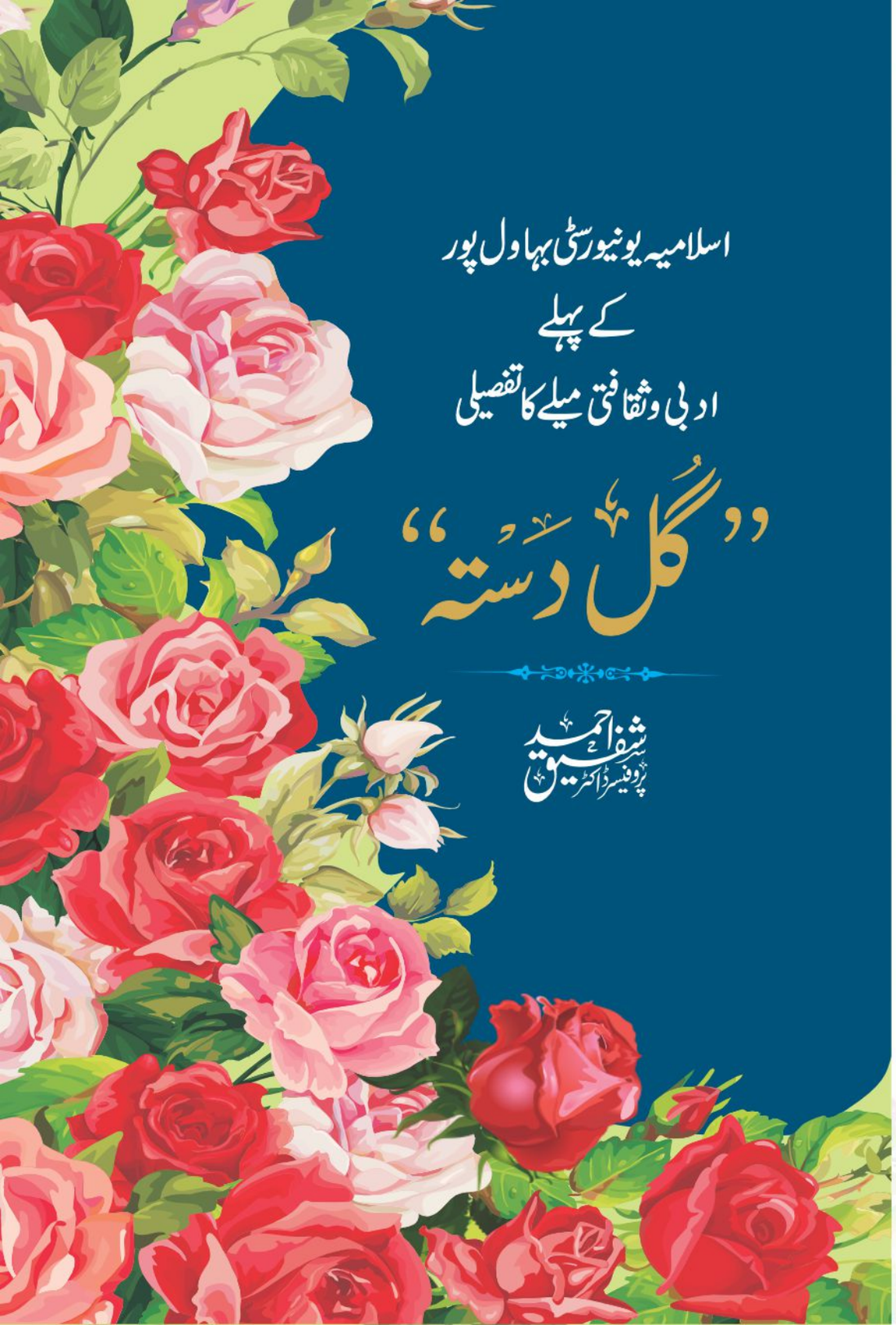

اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور
کے پہلے
ادبی و ثقافتی میلے کا تفصیلی

"گل دستہ"

پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد

Designed & Printed by: The University Printing Press, IUB
Ph: # +92-62-9255598, E-mail: upp@iub.edu.pk

دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاول پور
کے پہلے
ادبی وثقافتی میلے کا تفصیلی
''گل دستہ''

پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب: ادبی وثقافتی میلے کا گل دستہ
مصنف: پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد
باراوّل: اکتوبر ۲۰۲۰ء
کمپوزنگ: سیّد اظہار علی
گرافکس:
تعداد: ۳۰۰
قیمت:
پتا: ۲۳۸۔اکبر کالونی ملحق سیٹلائٹ ٹاؤن (سی)، بہاول پور
رابطہ: ۰۳۳۴۔۰۱۰۱۹۴۷

انتساب

دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاول پور

کے

نام

ادبی وثقافتی میلہ.....آئی یو بی

(۱۱۔۱۲مارچ ۲۰۲۰ء)

فارسی زبان کی یہ کہاوت ''ہر کہ آمد، عمارت نو ساخت'' بہت تسلسل اور تواتر سے استعمال ہوتی ہے۔اس ضرب المثل کے کئی معانی اور مفہوم ہیں لیکن اس میں مستعمل لفظ ''نو'' بہت اہم ہے۔ نیا پن نہ ہوتو انسانوں اور دیگر حیوانات کی زندگی میں کوئی فرق نہ رہے اور اس نئے پن ہی کی وجہ سے انسان زمین کو تسخیر کر کے چاند ستاروں پر کمندیں ڈال اور انہیں اپنے زیرِ نگیں لانے کی کوشش کر رہا ہے۔اسی نئے پن کے جنون میں ایک بہاول پوری نواب نے اپنی والدہ کی وفات پر ۱۸۷۹ء میں صدقۂ جاریہ کے طور پر بہاول پور میں ایک دینی مدرسہ بنایا تھا جسے ۱۹۲۵ء میں نواب صادق محمد خان خامس نے مصری تعلیمی ادارے ''جامعہ ازہر'' کی شکل عطا کی اور اس کا نام جامعہ عباسیہ رکھا۔ ۱۹۶۳ء میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان اور نواب امیر محمد خان نے اس ادارے کو ترقی دے کر ''جامعہ اسلامیہ'' کا نام دیا۔اس کے علاوہ یہاں سائنس کی تعلیم کے علاوہ تین شعبہ جات میں ایم۔اے کے نصابات کی تدریس ہونے لگی۔ ۱۹۷۵ء میں وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کے حکم سے اس ادارے کو مکمل یونیورسٹی کا درجہ ملا اور اس کے دس شعبہ جات میں ایم۔اے، ایم ایس سی کی سطح کی تدریس وتحقیق شروع ہوئی۔

ابتداء میں اسلامیہ یونیورسٹی دو کیمپسوں اولڈ کیمپس (موجودہ نام عباسیہ کیمپس) اور ریلوے کیمپس (موجودہ نام خواجہ فرید کیمپس) پر مشتمل تھی۔ ۱۹۸۰ء میں موجودہ

بغداد الجدید کیمپس کا ۱۲۵۷ ایکڑ پر مشتمل رقبہ ملا تو یونیورسٹی کے تین کیمپس ہو گئے۔ اسی طرح اسلامیہ یونیورسٹی کے دو کیمپس بہاول نگر اور رحیم یار خان میں بھی قائم اور بہترین کارگزاری دکھا رہے ہیں جب کہ ایک زمانے میں اسلامیہ یونیورسٹی کے الحاقی ادارے صادق آباد سے اسلام آباد اور مری تک پھیلے ہوئے تھے۔

نئے پن کی بات ہو تو اسلامیہ یونیورسٹی کا سلسلۂ علم ''خطباتِ بہاول پور'' سے شروع ہو کر سائنس کانفرنس، سیرت کانفرنس، خواجہ فرید کانفرنس، اُردو کانفرنس اور میتھ میٹیکل سیمی نار منعقدہ اسلام آباد تک پھیلا ہوا ہے۔ ''خطباتِ بہاول پور'' ریڈیو سے بار بار نشر ہوئے، کئی مرتبہ چھپے اور انگریزی میں ترجمہ ہو کر دنیا بھر میں پھیلے۔ کاش! ان کانفرنسوں اور سیمی ناروں کی رودادیں اور مقالات بھی شائع ہو کر افادۂ عام کا ذریعہ بنتے جب کہ اساتذہ و طلباء کی سوسائٹیاں بھی اسلامیہ یونیورسٹی کے علاوہ کسی دوسری یونیورسٹی میں نظر نہیں آتیں۔ یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ اب افلاطون اور طوسی کے طریق تعلیم اور صرف کلاس لیکچر سے بات نہیں بنتی کہ کائنات لحہ بہ لحہ کروٹیں لے اور پہلو بہ پہلو تبدیل ہو رہی ہے۔ جدید ایجادات نے دنیا کو سکیڑ دیا ہے اور علم اس قدر پھیلا دیا ہے کہ وسیع مطالعہ، گہرے مشاہدے اور عملی تجربے کے بغیر چیزوں کو سمجھنا آسان نہیں رہا۔ یہی سبب ہے کہ اب ترسیلِ علم کے لیے کتابی، علمی اور ادبی میلے لگائے جاتے ہیں۔ اس رسم کا آغاز کراچی کی آرٹس کونسل سے ہوا تھا۔ پھر یہ سلسلہ لاہور و اسلام آباد میں پہنچا۔ پچھلے کچھ عرصے سے فیصل آباد اور سرگودھا بھی اس سے مستفید ہوئے لیکن بہاول پور کے اہلِ علم اس نوعیت کی سرگرمیوں سے محروم تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ بہاول پور کے ریگ زاروں میں بہار آ گئی اور نئے طریقے سے سوچنے والے ایک نئے وائس چانسلر نے اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کی باگ ڈور سنبھال لی۔

انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب (تمغۂ امتیاز) نے اپنی علمی و تعلیمی منازل

کراچی اور امریکہ میں طے کیں۔ الصفہ یونیورسٹی کراچی سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ خواجہ فرید انجینئرنگ یونیورسٹی رحیم یار خان کے پہلے وائس چانسلر ہونے کا اعزاز پایا اور ۲۳ جولائی ۲۰۱۹ء کو ڈاکٹر صاحب نے اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے تیرہویں باقاعدہ وائس چانسلر کے طور پر اپنے منصب کا جائزہ لیا۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اِدھر وائس چانسلر نے کام شروع کیا اُدھر یار لوگ وائس چانسلر کے خلاف مختلف طریقوں سے سرگرمِ عمل ہو گئے۔ یہ بھی درست ہے کہ اکثر وائس چانسلر چارج لینے سے پہلے ہی کچھ رفقاء کار کو سبق سکھانے کی باتیں شروع کر دیتے ہیں۔ حکومتی کارندے بھی نئے وائس چانسلر کو اپنی پسند ناپسند کے باعث سابقہ وائس چانسلر کو مقدموں میں اُلجھانے کا راستہ دکھاتے اور کرپشن کے الزامات لگانے کا سبب بنتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ رات دن ساتھ اُٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، حضر و سفر میں ساتھ دینے اور ایک دوسرے کے جائز و ناجائز مفادات پورے کرنے والے تو توں سے بھی پہلے آنکھیں بدلتے اور نظریں چرانے لگتے ہیں لیکن اوّل تو خوش قسمتی اور نیک نیتی سے فرائض دینے کی خواہش کے باعث انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب اس مشکل میں پڑنے سے بچ گئے۔ دوسرے انھوں نے اپنے رویے، طور طریقوں اور کریمانہ اخلاق سے اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے سبھی افراد کے مسائل حل کیے، سب کو ترقیاں دیں اور سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ممکن ہے کہ بہت سے دلوں میں اب بھی اپنے ہم نشینوں کے لیے کوئی کدورت موجود ہو لیکن اس وقت نہ کسی کا اخلاقی حق مارا گیا ہے اور نہ کسی کے قانونی حق پر کوئی زد پڑی ہے، اسی لیے سب خوش و خرم اور دل و جان سے اپنے اپنے کارِ منصبی میں لگے ہوئے ہیں۔ تبھی اسلامیہ یونیورسٹی کا عظیم الشان ادبی و ثقافتی میلہ ممکن ہوا۔ اس امر کا ذکر تو کسی اور موقع پر زیادہ مناسب ہو گا لیکن یہاں بھی اس کا ادراک ضروری ہے کہ انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب سوال سے نہیں جھجکتے اور نہ اپنے

منصب کو ترک کرنے سے ہچکچاتے ہیں اور اسی لیے چند ماہ پہلے وہ کراچی یونیورسٹی تشریف لے گئے جہاں ان کی ملاقاتیں دیگر شعبہ جات کے اساتذہ و سربراہوں بطورِ خاص شعبۂ اُردو کی سربراہ ڈاکٹر تنظیم الفردوس سے بھی ہوئی۔ غالباً کراچی آرٹس کونسل کے ثقافتی فیسٹیول کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں اپنی یونیورسٹی کے حوالے سے نئی بات کی شروعات یہیں سے ہوئی جسے سیّد تابش الوری اور رحیم یار خان میں عمران بشیر کی قربت نے اُجالا فراہم کیا۔ پھر ایک دن آیا جب اسلامیہ یونیورسٹی کے بہت سے اساتذۂ کرام، صدور شعبہ اور ڈین حضرات کے علاوہ آرٹس کونسل کے ڈائریکٹر، ڈپٹی ڈائریکٹر انفارمیشن، مرکزی لائبریری کے منتظم اعلیٰ اور دو ریٹائر پروفیسروں کو ایک دعوت نامہ ملا جس کی رُو سے یہ افراد ۲۷ جنوری ۲۰۲۰ء کو تین بجے سہ پہر وی سی سیکرٹریٹ کے کانفرنس روم میں جمع ہوئے۔ یہاں دو بہت ہی نادرالوجود اور انوکھی باتیں وقوع پذیر ہوئیں۔ اوّل یہ کہ اجلاس کا آغاز کسی نمائشی جاہ وجلال اور تزک واحتشام یا 'ہٹو بچو' کے اعلانات کے بغیر ہوا۔ انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب نے خود ہی چند آیاتِ ربانی کی تلاوت فرمائی۔ اجلاس شروع ہوئے دس پندرہ منٹ کا دورانیہ گزر چکا تھا کہ کانفرنس ہال کے آخری شمالی دروازے سے سیّد تابش الوری ہال میں داخل ہوئے۔ تمام شرکاء کا خیال رہا ہوگا کہ تابش صاحب کے لیے جگہ بنادی جائے گی اور وہ کہیں بیٹھ جائیں گے لیکن ہوا بالکل مختلف اور انوکھا واقعہ کہ خود صدرِ مجلس نے اپنی نشست چھوڑ دی، اپنے لیے جگہ بنائی اور مائیک سمیت اپنی جگہ سیّد تابش الوری کے لیے خالی کردی۔ یوں اب اجلاس کی صدارت وائس چانسلر کی بجائے سیّد تابش الوری کرنے لگے۔ یہ منظر کسی اور جگہ دیکھا گیا ہو تو دیکھا گیا ہو لیکن پاکستان بطورِ خاص اسلامیہ یونیورسٹی میں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ بہرحال یہ اجلاس تین ایک گھنٹے جاری رہا جس میں دو تین باتیں سامنے آئیں۔ اوّل یہ کہ اسلامیہ یونیورسٹی نئی کروٹ

لے، طلباء و اساتذہ اور دیگر اہلِ شہر کو ساتھ ملا کر اس علاقے کا پہلا ادبی وثقافتی فیسٹیول کرنے جا رہی ہے، دوم یہ کہ سہ روزہ ادبی میلے میں کشمیر مذاکرہ، کتاب میلہ، پتلی تماشا، تقریری مقابلہ، پٹ شو، قرأت اور حمد ونعت کا مقابلے اور شعر خوانی کے پروگرام ترتیب دیئے جائیں گے جب کہ فیسٹیول کا اختتام ایک یادو مشاعروں پر ہوگا۔ اجلاس کے دوران میں مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس سارے فیسٹیول میں میری ممکنہ ذمہ داریاں کیا ہوسکتی ہیں؟ لہٰذا میں نے اس حوالے سے اپنا کام شروع کردیا لیکن پھر ایک طویل دورانیہ آگیا بلکہ فروری کا سارا مہینا انتظار میں گزر گیا۔ موسمی حالات کے علاوہ ملک کی معاشی حالت ڈراتی تھی اور اندیشہ تھا کہ ایسے بڑے پروگرام کی اجازت شاید نہ ملے اور اسی سبب سے یہ طویل خاموشی ادبی میلے اور فیسٹیول کے التواء کی وحشت ناک خبر دیتی تھی لیکن یونیورسٹی کی طرف سے ایک اور دعوت نامہ موصول ہوا جس میں گیارہ، بارہ مارچ کے پروگرام کی ممکنہ تفصیل دی گئی تھی۔ اس اجلاس کی صدارت بھی وائس چانسلر انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب کی موجودگی کے باوجود سیّد تابش الوری نے کی۔ اجلاس میں یونیورسٹی ڈپٹی رجسٹرار تعلقاتِ عامہ شہزاد احمد خالد نے پروگرام کی تفصیل بتائی۔ اُن کی گفتگو اور تحریری ایجنڈے کے مطابق گیارہ مارچ ۲۰۲۰ء کو ''بہاول پور ادبی و ثقافتی فیسٹیول'' کا افتتاحی اجلاس مین آڈیٹوریم بغداد الجدید کیمپس میں گیارہ بجے قبل از دوپہر ہونا تھا۔ اس پروگرام کے معتمد آغا صدف مہدی جب کہ مہمانِ خصوصی ممکنہ طور پر صوبائی وزیر تعلیم برائے اعلیٰ تعلیم تھے۔ خصوصی خطاب معروف صحافی وجاہت مسعود کا تھا۔ افتتاحی اجلاس سے متصل دو پروگرام تھے۔ ایک کتاب میلہ اور دوسرا ہاکڑا آرٹ گیلری کی نمائش تھی۔ اس کے فوراً بعد گیارہ بجے اسلامک لرننگ فیکلٹی کے آڈیٹوریم میں قرأت ونعت خوانی کا مقابلہ تھا جس میں سیّد صداقت علی اور عبدالرؤف روفی بطور مہمان مدعو تھے جب کہ پروفیسر ڈاکٹر راحیلہ خالد قریشی کی سربراہی میں ڈاکٹر محمد سعید شیخ اور محمد اکرم اُن

کے معاون تھے۔ دو بجے سہ پہر منعقد ہونے والے پالتو جانوروں کے شو کا انتظام وانصرام ویٹرنری کالج کے پرنسپل اور اُن کے ساتھیوں کے ذمہ تھا اور یہ شو مچھلی فارم اور اُس کے اِردگرد پھیلے ہوئے زرعی علاقے میں ہونا تھا۔ تین بجے شام مین آڈیٹوریم بغداد الجدید کیمپس میں سوشل میڈیا ورلڈ کے علاوہ موبائل ایپ، ویب ڈیزائننگ اور ویڈیو گرافی کے مقابلے ہونا تھے۔ اسی موقع پر مسٹر نادر علی یوٹیوبر کی خصوصی گفتگو بھی تھی اور اس کے ذمہ دار مسٹر رضوان مجید، ڈاکٹر ملک محمد سعد اور انجینئر ڈاکٹر اسجد امین تھے۔ یہ سارا پروگرام ڈاکٹر شہزاد رانا ایڈوائزر میڈیا سٹڈی سوسائٹی اور ڈاکٹر قیصر جبیں ایڈوائزر سائنس سوسائٹی کی رہنمائی میں طے تھا۔

اس شام رات کے آخری پروگرام کے ذمہ دار ڈاکٹر عبدالواجد خان، ایڈوائزر پرفارمنگ اینڈ آرٹ سوسائٹی، ڈائریکٹر آرٹس کونسل بہاول پور اور مسٹر جہاں زیب رحمت کی سرپرستی میں مین آڈیٹوریم میں ہونا تھا۔ یہ پروگرام درحقیقت صوفی نائٹ اور ثقافتی گائیکی سے متعلق تھا جس میں ممکنہ طور پر صنم ماروی، حمیرہ ارشد اور ذیشان بخاری کو اپنے فن کا مظاہرہ کرنا تھا۔

اگلی صبح دس بجے اسلامک لرننگ فیکلٹی کے آڈیٹوریم میں ذوالسانی تقریری اور پھر بیت بازی کا مقابلہ تھا جس کے ممکنہ مہمانِ خصوصی سیّد اقرار الحسن، سیّد توثیق حیدر یا ضرورت پڑنے پر کسی بھی دوسری شخصیت کو ہونا تھا۔ اس پروگرام کے منتظم پروفیسر ڈاکٹر ارشاد حسین، ڈاکٹر صبیحہ رحمانی اور ڈاکٹر سیّد مصطفےٰ حیدر زیدی تھے جب کہ ڈاکٹر مظہر حسین ڈبیٹنگ سوسائٹی کے ایڈوائزر تھے۔ گیارہ بجے صبح اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کا ''میڈیا مذاکرہ'' تھا جس کا موضوع ''مسئلہ کشمیر، انسانی حقوق کی پامالی، ذرائع ابلاغ خصوصاً سوشل میڈیا اور نوجوان'' تھا۔ پروگرام کے ممکنہ شرکاء میں وجاہت مسعود، کترینہ منظور، سلیم بخاری، نعیم مسعود اور عبدالہادی معیار تھے جب کہ اس کے منتظمین

میں ڈاکٹر سجاد احمد پراچہ، ڈاکٹر آفتاب حسین گیلانی، شہزاد احمد خالد اور ڈاکٹر اظہر حسین تھے۔ مؤخر الذکر اسلامیہ یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات کی کریکٹر بلڈنگ سوسائٹی کے ایڈوائزر بھی ہیں۔

بارہ مارچ کی سہ پہر تین بجے دو پروگرام رکھے گئے تھے اور امکان یہ تھا کہ ان میں سے جو پروگرام ممکن ہو، اُس کا انعقاد ہو جائے گا۔ ایک ترجیح یہ تھی کہ مین آڈیٹوریم بغداد الجدید کیمپس میں مختلف کھیلوں کے عالمی اور نامور قومی کھلاڑیوں مثلاً سکوائش میں جہانگیر خان، ہاکی میں فلائنگ ہارس سمیع اللہ خان، عاطف بشیر اور مطیع اللہ خان کو مدعو کیا اور اُن سے اُن کے تجربات شیئر کیے جائیں۔ ممکن ہو تو کرکٹ کی کسی خاتون کھلاڑی کو بھی بلایا جائے۔ اس کے لیے ڈاکٹر آفتاب حسین گیلانی ایڈوائزر سپورٹس سوسائٹی، امجد فاروق وڑائچ ڈائریکٹر سپورٹس اور مسز مہوش اسسٹنٹ ڈائریکٹر سپورٹس کو ذمہ داریاں سونپی گئیں لیکن کسی دقت کے سبب سے یہ پروگرام نہ ہو تو پھر تھیٹر و ڈرامے کا میدان سجایا جائے۔ اس کے لیے شیما کرمانی اور سلیمہ ہاشمی کو زحمت دی جائے کہ بطور مہمانِ خصوصی شرکت فرمائیں اور اس کا انتظام وانصرام مسز ماریہ انصاری پرنسپل آرٹ اینڈ ڈیزائن کالج، مسٹر فرجاد فیض اور آغا صدف مہدی کے ذمہ ہو۔

سارے فیسٹیول کا آخری جز ایک مشاعرہ تھا جس میں تینوں زبانوں یعنی اُردو، سرائیکی اور پنجابی شعراء کو زحمت دینا تھی۔ ابتداء ہی میں طے کر لیا گیا تھا کہ انور مسعود، امجد اسلام امجد، زاہد فخری اور خالد مسعود کو مشاعرے میں یقینی طور پر بلایا جائے گا۔ اس پروگرام کا اہتمام شعبۂ فارسی کی استاد ڈاکٹر مسرت واجد کے ذمہ لگایا گیا کہ وہ ایڈوائزر لٹریری سوسائٹی کے طور پر کام کر رہی ہیں جب کہ شفیق احمد، ڈاکٹر عمران بشیر صدر شعبہ اُردو، پنجاب کالج رحیم یار خان اور پروفیسر ڈاکٹر روبینہ رفیق چیئرپرسن شعبۂ اُردو و اقبالیات اسلامیہ یونیورسٹی بھی معاملات کو دیکھیں گے۔

اوّل تو اس طرح کے پروگراموں میں آخری وقت تک ردوبدل ہوتا رہتا ہے لیکن اس کے علاوہ بھی بہت سے معاملات ہوتے ہیں جن میں ذرا سی کوتاہی یا غفلت سارے پروگرام کو تہہ و بالا کر دیتی ہے۔ اسی سبب سے جناب وائس چانسلر نے اپنے رفقاء کے مشورے سے دیگر کمیٹیاں بھی ترتیب دیں۔ مثلاً کتابوں کی نمائش کے لیے پروفیسر ڈاکٹر روبینہ طارق، رانا جاوید اقبال، مسٹر طارق محمود، سلمان بن نعیم اور ڈاکٹر عاطف نواز پر مشتمل کمیٹی بنائی گئی۔ ہاکڑا آرٹ گیلری کی نمائش کے لیے ماریہ انصاری، فرجاد فیض اور مسٹر عمران فیض یاب پر مشتمل کمیٹی تشکیل دی گئی۔ کھانے پینے کے حوالے سے مسٹر محسن متین، مسٹر فیضان شیخ، مسٹر سہیل امین اور مسٹر اسد نعیم چودھری پر مشتمل کمیٹی بنائی گئی۔ اسی طرح سٹیج ڈیکوریشن، پوسٹر، ڈسپلے اور تحریر و تسوید کے لیے بنائی گئی کمیٹی میں ڈاکٹر عمر فاروق، ڈاکٹر صبیحہ رحمانی، ڈاکٹر اظہر حسین، مسٹر فیض یاب اور مسز فاطمہ مظاہر تھے۔ آنے جانے والے مہمانوں کے ٹکٹوں کے ذمہ دار فیضان شیخ اور ڈاکٹر عاطف نواز تھے۔ بظاہر کہیں ذکر اور نام تو نہیں تھا لیکن وائس چانسلر آفس کے عملے میں شیخ محمد خالد، مسٹر وسیم احمد صدیقی، محمد ہارون اور دیگر افراد نے بھی شب و روز کام کیا اور ایک ایک چیز کو دیکھا۔

یہ طے ہو گیا کہ مشاعرہ ہو گا تو اس حصے کے منتظمین کو یہ فکر لاحق ہونا چاہیے تھی کہ محدود وقت میں سرائیکی و اُردو شعراء میں سے کس کس کو اور کیسے بلایا جائے گا؟ لیکن ڈاکٹر عمران بشیر رحیم خان میں تھے جب کہ ڈاکٹر روبینہ رفیق، پروفیسر ڈاکٹر عقیلہ شاہین کے بیٹے کی شادی کے سبب مصروف تھیں اور اسی سبب سے آج کے اجلاس میں تشریف نہیں لا سکی تھیں اور شعبۂ اُردو و اقبالیات کی نمائندگی پروفیسر ڈاکٹر عامر سہیل نے کی تھی۔ آج کے اجلاس میں ڈاکٹر لیاقت علی بھی نہیں تھے البتہ ڈاکٹر مسرت واجد تشریف رکھتی تھیں جو اس سوسائٹی کی آرگنائزر تھیں۔ لہٰذا ''ساظر'' (سامع + ناظر) نے ڈاکٹر صاحبہ

سے رابطہ کر کے اگلے دن شعبۂ فارسی میں سوسائٹی کا ایک اجلاس بلا لیا۔ اگلے دن اجلاس کے آغاز میں ساظر نے اُردو مجلس بہاول پور کے سیکرٹری ڈاکٹر عاصم درّانی اور چولستان ادبی فورم کے رکنِ رکین ڈاکٹر افتخار علی افتخار کی طرف سے بنائی گئی مشترکہ فہرست شرکاءِ اجلاس کے سامنے رکھی جس میں ایوانِ صدر اسلام آباد کے مشاعروں میں شامل شاعر اور اُن کے موبائل فون نمبر بھی تھے جو معمولی ردوبدل کے ساتھ اپنا لی گئی لیکن اجلاس کے شرکاء کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ شعراء کتنے، کون کون اور کس قدر مشاہرے پر بلائے جا سکیں گے؟ لہٰذا یہ معاملہ مؤخر کر دیا گیا۔ اسی اثناء میں معلوم ہوا کہ رحیم یار خان سے شاعروں کو بلوا دینے کا عمل شروع ہو گیا ہے لہٰذا پھر ایک اجلاس بلایا گیا جو اولڈ کیمپس میں وی سی سیکرٹریٹ کے کانفرنس ہال میں منعقد ہوا جس میں سیّد تابش الوری بھی شامل تھے۔ اس اجلاس میں ایک فہرست طے ہو گئی جس کے حوالے سے ساظر نے ایک موبائل پیغام کے ذریعے سیّد تابش الوری کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی کہ شاعروں کی فہرست میں بہاول پوری حصہ بہت کم رہ گیا ہے اور حقیقت بھی یہی تھی کہ اس لسٹ میں بہاول پور شہر کے شاعر بھی بہت کم تھے چہ جائے کہ بہاول پور سے صادق آباد اور بہاول پور سے بہاول نگر و فورٹ عباس کے شعراء جگہ پا سکتے لیکن ہم سب لوگ اس ادبی فیسٹیول کو ہر صورت کامیاب دیکھنا چاہتے تھے اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ اختلاف کا موقع بالکل پیدا نہ ہو لیکن ''اختلاف ہی زندگی ہے'' کے مصداق اختلاف کی ایک صورت پیدا ہو ہی گئی۔ ہوا یوں کہ مشاعرے کی انتظامی صف بندی کے حوالے سے شعبۂ اُردو و اقبالیات میں ایک اجلاس ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر غلام اصغر اور ذیشان تبسم استادِ شعبۂ اُردو و اقبالیات بھاگم بھاگ کہیں سے تشریف لائے اور بتایا کہ اظہر فراغ نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ وہ مشاعرے میں کسی صورت بھی محمد افضل خان سے پہلے نہیں پڑھیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس خبر پر ساظر سمیت سبھی

لوگ کیا استاد اور کیا طالب علم، سیخ پا ہو گئے اور طے کر لیا کہ اگر اظہر فراغ ایسا کرتے ہیں تو انھیں ایسا کرنے دیں۔ مشاعرہ تو اُن کے بغیر بھی ہو جائے گا لیکن ساظر نے سوچا کہ یہ فیصلہ درست ہونے کے باوجود غلط ہے کہ کوئی شاعر بلایا نہ جائے یا کسی اور سبب سے آ نہ سکے تو اور بات ہے لیکن کسی کو بلایا جائے اور اُس کے پاس نہ آنے کا کوئی معقول عذر بھی نہ ہو اور بالفرض معقول عذر ہو بھی تو اس کے باوجود شاعر و ادیب کو شہر کی عزت اور یونیورسٹی کی توقیر کے سبب ضد نہیں کرنا چاہیے اور اس کے لیے ہمیں بھی تھوڑی بہت کوشش کرنا چاہیے۔ سو ساظر نے گھر آ کر تقریباً آٹھ بجے رات عزیزم اظہر فراغ کو فون کیا۔ انھوں نے اپنا عذر پیش کیا لیکن ساظر کے دو چار جملوں کے نتیجے میں وہ کسی قدر پسیج گئے لیکن دس پندرہ منٹ بعد اُن کی کال آ گئی اور ساظر کی دوبارہ درخواست پر انھوں نے اپنی شرائط واپس لے لیں اور وعدہ کر لیا کہ وہ مشاعرے میں آئیں گے اور وہیں پڑھیں گے جہاں انھیں بلایا جائے گا۔ ساظر نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور اُن کے بڑے پن کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر ذیشان اطہر اور ذیشان تبسم دونوں کو اس امر کی اطلاع دے دی کہ وہ اظہر فراغ کا نام شاعروں کی فہرست میں شامل رکھیں۔ شکریے کی ضرورت یوں تھی کہ اوّل تو ادیب و شاعر یونہی نازک مزاج اور پھر بہاول پور کے ادیب و شاعر۔ اللہ معاف کرے ایک زمانے میں یہاں دو شاعروں نے مل کر ایک ادبی تنظیم ''بزمِ نور'' بنائی۔ ایک تنظیم کے صدر دوسرے معتمد لیکن چند ماہ بعد کسی مسئلے پر اختلاف ہو گیا۔ دونوں کے دوست احباب لاکھ درمیان میں پڑے لیکن وہ اختلاف ہی کیا جو ختم ہو جائے۔ لہٰذا معتمد نے نئی تنظیم ''بزمِ نور بہاول پور'' بنالی۔ صدر پیچھے کیوں رہتا؟ لہٰذا اُس نے ''بزمِ نور بہاول پور ڈویژن'' کی بنیاد رکھ دی۔ پھر یہی تنظیم پنجاب اور پاکستان تک جا پہنچی اور اگر ایک کا بے وقت انتقال نہ ہو جاتا تو بات شاید ''بزمِ نور کائنات'' تک پہنچتی اور خدا جانے یہ اختلاف مزید کیا کیا رنگ دکھاتا؟

اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کی پہلی اُردو کانفرنس (اس سے قبل ۱۹۸۸ء سے ۲۰۰۷ء تک سیمینار ہوتے اور اکثر چھپتے تھے) منعقد ہوئی تو اُس روز بھی بارش نے جل تھل ایک کر دیا تھا جس کے باعث حدت آمیز موسم میں کسی قدر خنکی آ گئی تھی جس کے سبب یوں لگتا تھا کہ بہاول پور نے ایک دن کے لیے اچھا موسم کہیں سے چُرا لیا ہے۔ آج بھی اچانک گھنے اور گہرے بادل آئے اور برس برس کر بغداد الجدید کیمپس سمیت سارے بہاول پور کو نہال کر دیا۔ خدشہ تھا کہ اس قدر شدید بارش کے باعث شاید مقامی شاعر بھی وقت مقررہ پر نہ پہنچ سکیں لیکن مغرب کی نماز کے فوراً بعد ہی شہزاد احمد خالد کا فون آ گیا جو انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب اور سیّد تابش الوری کے بعد اس ادبی و ثقافتی میلے کے روح و رواں تھے۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ میں کہاں ہوں؟ ساظر نے جواب دیا کہ گاڑی میں بیٹھ چکا ہوں اور اب یہ ڈرائیور اور راستے کی صورتِ حال پر منحصر ہے کہ اُن کے پاس کب تک پہنچ پاتا ہوں؟ راستے میں تھا جب خیال آیا کہ معلوم نہیں خورشید ناظر تک بھی دعوت نامہ اور وقت معین کی اطلاع پہنچی کہ نہیں؟ لہٰذا فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ بالکل بے خبر ہیں۔ اُن سے جلد روانہ ہونے اور مشاعرے میں آنے کی درخواست کی۔ ایک دو منٹ بعد پھر خیال آیا کہ اُن سے پوچھ لوں کہ کیا انھیں مشاعرے کی جگہ کا بھی پتا ہے؟ معلوم ہوا کہ وہ گھوٹوی ہال کی طرف روانہ ہو رہے ہیں لیکن اچھی بات یہ تھی کہ انھوں نے تا حال منزل کا تعین نہیں کیا تھا۔ ساظر فون نہ کرتا تو وہ گھوٹوی ہال تک آ کر گھر لوٹ جاتے۔ بہر حال ساظر بغداد الجدید کیمپس کے مین آڈیٹوریم کے سامنے پہنچا تو واقعتاً گیٹ ہی پر میلے کا سماں دیکھا۔ طلبہ و طالبات، سابق طلبہ و طالبات، اساتذۂ کرام اور ریٹائرڈ اساتذۂ کرام کے علاوہ تمام متعلقہ گروپ اور افراد آ جا رہے تھے اور ہال کے مین گیٹ پر بھی کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ مین گیٹ ہی پر غلام علی قمر ملے جو اپنے زمانۂ طالب علمی سے ادبیات کے طالب علم نہ ہونے کے باوجود شعر و ادب

میں دلچسپی لے رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں انھیں مشاعرے میں شامل ہونے کی اجازت دلواؤں لیکن یہاں تو قیامت کا سماں تھا اور صبح وشام کے ملنے والے ساظر کو بھی نہیں پہچان رہے تھے۔ اسی اثناء میں مجھے شہزاد احمد خالد نے دیکھ لیا۔ وہ خود باہر آئے اور مجھے ساتھ لے کر ایک چھوٹے ہال کے دروازے پر پہنچایا اور کہا کہ کچھ شاعر آ گئے ہیں اور کچھ آ رہے ہیں۔ لہٰذا ان سے آپ ہی بھگتیں۔ ساظر اس ہال میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ڈاکٹر مسرت واجد آرگنائز رلٹریری سوسائٹی اپنی فطری انتظامی صلاحیتوں کے ساتھ سوسائٹی میں شامل طلبہ و طالبات کے ذریعے مہمانوں کی آؤ بھگت میں مصروف تھیں۔ ڈاکٹر مسرت واجد شعبۂ فارسی میں اسسٹنٹ پروفیسر کے درجے پر فائز ہیں۔ ان کا شمار اسلامیہ یونیورسٹی کے اُن اساتذہ میں ہوتا ہے جنھوں نے یہیں سے ایم۔اے کیا اور یہیں سے اپنے تدریسی کیریئر کا آغاز کیا۔ یہ بھی اُن بہت سے اساتذہ میں شامل ہیں جنھوں نے بہت کچھ چھوڑ دیا مگر اپنے شعبے سے وفاداری کا تعلق قائم رکھا لیکن انھیں اس وفاداری کا جیسا صلہ ملنا چاہیے تھا، وہ نہیں ملا اور دسمبر ۱۹۹۴ء سے اب تک تقریباً چھبیس سال کی تدریسی خدمت کے باوجود اسسٹنٹ پروفیسر ہیں لیکن وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہمہ تن مصروف تھیں اور مہمانوں کو چائے بنا بنا کر دے رہی تھیں۔ ان کے ساتھ حفیظ فیضی صدر لٹریری سوسائٹی بھی اپنے سارے ساتھیوں کے ساتھ بہت مصروف تھے۔

ساظر نے دیکھا کہ کچھ شاعر آنے جانے، چائے پینے اور لذیذ بسکٹوں کے ساتھ دل بہلانے کے علاوہ اپنے اپنے موضوعات پر گفتگو کر رہے تھے۔ ان میں سے کچھ ایسے تھے جو مہمان تھے لیکن بالکل خاموش، کچھ 'ہوں ہاں' میں جواب دیتے تھے، کچھ باہمی جملہ بازی میں لگے وقت گزار اور ہنس بول رہے تھے۔ کچھ نے اپنے سفر کی دلچسپیوں اور کلفتوں کو موضوع بنا رکھا تھا اور شعراء کے ایک گروہ نے امجد اسلام امجد

کو گھیر رکھا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ آج کے انتظامات سے سبھی مطمئن تھے اور یہ خوشی اس وقت دیدنی ہوتی جب پروفیسر ڈاکٹر روبینہ رفیق اور ذیشان تبسم قلم اور کاغذوں کا ایک پلندہ لے کر ان لوگوں میں سے کسی کے پاس آتے۔ پروفیسر ڈاکٹر روبینہ رفیق ہمارے شعبے کی وہ اُستاد ہیں جنھوں نے شعبۂ اُردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے سلور میڈل کے ساتھ ایم۔اے کر کے ۱۹۸۷ء میں شعبۂ اُردو و اقبالیات اسلامیہ یونیورسٹی میں اپنے منصب کا جائزہ لیا۔ ان کی گفتگو، لیکچر، خط، تحریر اور عمومی رویہ ایک اچھے اُستاد کے شایانِ شان تھا۔ ساظر کو یہ بھی معلوم تھا کہ ان کا انتخاب بہت سی سفارشوں، احکام اور دباؤ کے باوجود بالکل میرٹ پر ہوا تھا۔ یہ سفارشیں، احکام اور دباؤ گورنر، گورنر ہاؤس، گورنر ہاؤس کے میڈیکل بورڈ کے چیئرمین، وائس چانسلر اور مقامی ایم پی اے کی طرف سے تھا اور ان کے حق میں صرف ان کا میرٹ اور ان کا انٹرویو تھا جسے ایکسپرٹس نے پرکھا اور انھیں ان کا حق دیا۔ انھیں درس و تدریس، تحقیق و تنقید، مطالعۂ کتب، موسیقی، ٹی وی ڈرامے اور کوئز پروگرام دیکھنے سے دلچسپی ہے۔ ہمہ جہت ادبی شخصیت ممتاز مفتی پر ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے، جسے چھپنا چاہیے۔ ان کی پی ایچ ڈی کے حوالے سے دو ایک خط ساظر کو بھی بھگتنا پڑے تھے۔ اب یہ خود پی ایچ ڈی نگران ہیں۔ انھوں نے آگے بڑھ کر ٹی اے / ڈی اے کی مد میں لکھا پڑھی اپنے ذمہ لی۔ اسی لیے انھیں ہر مدعو شاعر کے پاس جانا اور فارم پر دست خط لینا پڑے۔ اسی سے اُن کے احساسِ ذمہ داری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر روبینہ رفیق کے ساتھ ذیشان تبسم بھی تھے۔ ذیشان تبسم نے اسلامیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو و اقبالیات ہی سے اس انداز میں ایم۔اے کیا کہ ان کے نمبرات کا ریکارڈ اب تک قائم ہے۔ ان کا نتیجہ آیا تو ساظر کو یوں لگا کہ جیسے ان کے نمبروں کے سامنے ساظر کا ایم۔اے کا رزلٹ ماند پڑ جائے گا۔ ساظر کو بس اللہ نے بچایا۔

ایم۔اے کے دوران میں انھوں نے مقالہ لکھا جس میں انھیں دو، دو نگرانوں کی نگرانی میسر آئی لیکن پی ایچ ڈی کا معاملہ یکسر اُلٹ گیا۔ دو کی بجائے ایک ہی ڈھنگ کا نگران مل جاتا تو ذیشان تبسم اپنی صلاحیت کی بنا پر اب تک چار پانچ نہیں تو پی ایچ ڈی کی دو تین ڈگریاں ضرور لے لیتے۔ بہرحال یہ شعبۂ اُردو ہی نہیں تحقیق و تنقید اور اس سے زیادہ کمپیئرنگ کے ماہر ہیں۔ اب تک اُن کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں اور یہ بھی روبینہ رفیق کی طرح بہت ذمہ دار شخص ہیں۔ تبھی یہ شعبہ انھیں ملا۔

اسی دوران میں اعلان ہوا کہ حضرات، آیئے مشاعرے میں چلیں۔ مشاعرہ اس آڈیٹوریم میں تھا جو اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے پہلے جلسۂ تقسیم اسناد کی دین اور پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیق خان وائس چانسلر کا تعمیر کردہ تھا۔ جنوبی پنجاب میں اس سے اچھا ہال کوئی نہیں ہے۔ کچھ برس پہلے کسی نظرِ بد کے سبب یہ ہال نذرِ آتش ہو گیا تھا لیکن پروفیسر ڈاکٹر قیصر مشتاق سابق وائس چانسلر نے اسے پھر سجا دیا۔ ساظر شاعروں کے ساتھ ہال میں داخل ہوا تو دو تین باتوں نے ساظر کو متاثر کیا۔ پہلی یہ کہ ہال کمیٹی نے خوب صورت ہال کو خوب صورت ترین بنا دیا تھا۔ دوسرا یہ کہ ہال میں بظاہر بارہ سو افراد کے بیٹھنے کی جگہ ہے لیکن اس وقت کم از کم دو ہزار کے قریب لوگ ہال میں سما گئے تھے کہ ہال کی تینوں سیڑھیوں میں بھی طلبہ و طالبات موجود تھے۔ تیسری اور اہم ترین بات وہ سلیقہ تھا جس کے ساتھ طلبہ و طالبات جگہ کی تنگی کے باوجود اطمینان سے بیٹھے تھے۔ اصل میں زیادہ تر طلبہ و طالبات کے لیے یہ ماحول اور پروگرام بالکل نیا تھا۔ اسی سبب سے ہال میں شور و غوغا بھی زیادہ تھا۔ شاعر تو سب سٹیج پر چلے گئے لیکن ساظر اس ماحول میں کہاں جائے؟ ایسے میں مناسب یہی تھا کہ ہال کے دروازے کے ساتھ ریٹائرنگ روم یا واپس ملٹی پرپز روم میں جایا جائے جہاں احباب کی چائے بسکٹ سے تواضع ہو رہی تھی۔ یہی سوچ کر پلٹنے لگا تو شہزاد احمد خالد کی عقابی نگاہوں نے حقیقتِ حال کا اندازہ

کر کے ساظر کا ہاتھ پکڑا اور ہال کی وسطی لائن میں پانچویں سطر کی پہلی سیٹ پر بیٹھے طالب علم کی طرف اشارہ کیا اور ساظر کو کہا کہ آپ وہاں بیٹھیں۔ تب اندازہ ہوا کہ شہزاد احمد خالد نے ایسے ہی بھیڑ وقت کے لیے جہاں تہاں اپنے ساتھی بٹھا رکھے تھے اور یہ نوجوان بھی انھی میں سے ایک تھا۔ خیر جہاں ساظر جا کر بیٹھا، اتفاق سے اُس ساری سطر میں تمتماتے ہوئے خوب صورت چہرے والی اٹھارہ بیس یا زیادہ سے زیادہ بائیس برس کی کوہ قافی لڑکیاں بیٹھی تھیں لیکن مجھ سے متصل نشست پر جو بچی بیٹھی تھی اُس کی عمر کسی قدر زیادہ تھی یعنی چوبیس چھبیس سال۔ اُس نے ساظر کو ڈھنگ سے بیٹھنے بھی نہیں دیا اور جھٹ سے سلام جڑ دیا۔ ساظر نے جواب دیتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا تو اُس کی کالی گہری آنکھوں میں شناسائی کی واضح جھلک تھی۔ ساظر نے سلام کا جواب دیا تو اُس نے تُرت ایک سوال کر دیا۔ پوچھنے لگی ''سر! لفظ ''مشاعرہ'' کس زبان کا لفظ ہے اور یہ کن معنوں میں استعمال ہوتا ہے؟'' ساظر نے فوراً کہا ''بھئی! مجھے کیا معلوم؟'' وہ فوراً بولی ''سر! آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میری بہن نے ماڈل ٹاؤن اے کے اُس ادارے سے ایم۔فل اُردو کیا ہے جہاں آپ پڑھاتے تھے۔ ابھی چار سال پہلے میں نے بھی اس ادارے سے کمپیوٹر کورس کیا تھا اور میں فارغ وقت میں باجی کے پاس چلی جاتی تھی لیکن یہ تھا کہ میں اُس وقت نقاب کرتی تھی۔ شاید آپ اس لیے نہیں پہچان پائے۔'' ساظر نے کہا ''نہیں! اگر طالب علم کسی سبب سے پڑھنے لکھنے میں دلچسپی نہ لے تب بھی میں پہچان نہیں پاتا۔ مجھے وہ طالب علم یاد رہتے ہیں جو پڑھنے لکھنے میں دلچسپی لیں۔ بہرحال جو سوال آپ نے پوچھا اب اُس کی طرف آتا ہوں۔ ابتداء میں صرف ایک بات ذہن میں رکھیں کہ 'ث'، 'ح'، 'ص'، 'ض'، 'ع'، 'غ'، 'ق' اور 'ء' وغیرہ بنیادی طور پر عربی زبان کے حروف ہیں اور انھی الفاظ میں پائے جاتے ہیں جو عربی ہوں یعنی 'ع' کی وجہ سے لفظ ''مشاعرہ'' عربی لفظ قرار پایا۔ اب اس لفظ کے تمام

حروف پر غور کیجیے تو آپ کو اس میں 'ش'، 'ع' اور 'ر' کے حروف نظر آئیں گے جن سے لفظ ''شعر'' بنا جس کے معنی ہیں ''دانائی، عقل کی بات'' اور زندگی کی کسی حقیقت کو تخلیقی رعنائی کے ساتھ حرفوں اور لفظوں میں پیش کرنا۔ یہ موزوں ہو تو مزید اچھا۔ اس لفظ میں پہلے حرف یعنی 'ش' کے بعد حرف 'الف' کے اضافے سے ''شاعر'' حاصل ہوا یعنی دانائی کی بات کرنے والا۔ موقع محل کے مطابق اس کی جمع ''شاعروں اور شعراء'' بنی۔ اب ذرا دو تین لفظوں کے معنی ''مقابلہ''، ''مظاہرہ''، ''مناظرہ'' اور ''مشاعرہ'' پر توجہ کریں۔ ان تمام الفاظ میں حروف 'م'، 'ا' اور 'ہ' مشترک ہیں۔ ان مشترکہ حروف کو نکال دیں تو لفظ کا بنیادی مادہ یا فعل ہاتھ آتا ہے۔ اسی سے فاعل اور مفعول وغیرہ بن جاتے ہیں اور فعل ہی سے مفاعلہ بنتا ہے جس کے لیے دو یا دو سے زیادہ افراد، گروہ یا اقوام کا تصور واضح ہوتا ہے۔ مثلاً مقابلہ تبھی ہوگا جب دو یا دو سے زیادہ لوگ کسی ایک چیز کے حصول کی کوشش کریں گے۔ مثلاً ہاکی، فٹ بال یا کرکٹ کا ورلڈ کپ جس میں بہت سی ٹیمیں مقابلے کرتی ہیں لیکن آخر میں کوئی ایک ٹیم کامیاب ہوتی اور کپ جیتتی ہے۔ ساظر خدا جانے مزید کیا کچھ کہتا کہ بے ہنگم شور شرابے میں تیسری نشست پر براجمان ایک لڑکی بولی ''لیکن یہاں تو کوئی مقابلہ نہیں ہونے والا۔ یہاں تو سنا ہے کہ بہت سے شاعر اپنا اپنا کلام سنائیں گے۔''

ساظر نے کہا ''آپ نے بالکل درست فرمایا لیکن جب لفظ ''مشاعرہ'' تخلیق ہوا تب مقابلہ ہی ہوتا تھا اور اس کی دو صورتیں تھیں۔ اوّل یہ کہ دو شاعروں نے ایک دوسرے کے مقابلے میں قصیدے پڑھے اور کسی منصف نے اپنے ذوق کے مطابق اچھے اور کم اچھے کا فیصلہ کر دیا لیکن اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ زمانۂ جاہلیت میں مکہ کے قریب ''عکاظ'' میں ایک میلہ ہوتا تھا جس میں شرکت کے لیے لوگ دُور دُور سے آتے اور اپنے ساتھ تجارت کا سامان بھی لاتے تھے۔ اس میلے میں تجارت کے ساتھ

ساتھ حج، عمرہ اور طوافِ کعبہ کے علاوہ مشاعرہ بھی ہوتا تھا۔ بہت سے شاعر اپنا اپنا کلام سناتے، سب سے اچھے قصیدے کو دیوارِ کعبہ کے ساتھ پہلے سے لٹکے ہوئے سات قصیدوں کے ساتھ رکھا جاتا۔ کسی قدر کم زور قصیدے کو الگ کر دیا جاتا اور نئے اور بہتر قصیدے کو باقی چھ کے ساتھ لٹکا دیا جاتا۔ اسی لیے ان قصیدوں کو ''سبع معلقات'' کہا جاتا ہے۔''

دور بیٹھی ہوئی لڑکی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا ''یہ ہوئی ناں بات'' لیکن ساظر کی شاگرد کی بہن نے مزید سوال کر دیا۔ وہ پوچھنے لگی ''پھر اگر یہ مشاعرہ نہیں ہے تو اسے کیا کہیں گے؟'' ساظر بولا ''بیٹے! یہ بحث بہت لمبی ہو جائے گی جب کہ یہ مشاعرہ کسی بھی وقت شروع ہو سکتا ہے تو بھی اتنا سن لیں کہ اسلام کی روشنی پھیلی تو اس طرح کی بہت سی قباحتیں ختم ہو گئیں۔ یہ الگ بات کہ شاعری جاری رہی۔ افغانستان اور ایران میں بہت سے مسلمان حکم ران رہے اور وہ اپنے اپنے درباروں میں شاعر بھی رکھتے تھے لیکن مشاعروں کی ایسی صورت ایران و افغانستان میں نہیں تھی حالانکہ اس خطے میں اعلیٰ سے اعلیٰ شاعر بھی پیدا ہوئے اور اصنافِ نظم و شعر بھی۔ ہندوستان میں محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کے گہرے اثرات کے باوجود نثر و نظم کی ترقی نظر نہیں آتی۔ بعد میں بھی جو شعراء سامنے آئے، اُن کی شخصی اور ذاتی مساعی ملتی ہیں۔ اُردو زبان و ادب کا پہلا گڑھ دکن بنتا ہے۔ اس کی پانچ ریاستوں میں شاعر بھی ہیں اور شعراء کو سرکاری و حکومتی سرپرستی بھی ملتی نظر آتی ہے لیکن مشاعرے نہیں ہیں البتہ مغلیہ حکومت کے عہدِ آخر میں اُردو زبان اور مشاعروں کی روایت بڑھتی چلی گئی۔ دہلی، فیض آباد اور لکھنؤ میں تو مشاعروں کی وہ کیفیت بھی نظر آتی ہے جس میں شاعر اُستادی شاگردی کے سلاسل میں بندھے ایک دوسرے کو نیچا دکھاتے نظر آتے ہیں۔ انشاؔ و مصحفیؔ، ذوقؔ و غالبؔ اور دبیرؔ و انیسؔ کے معرکے اس کی نمایاں مثال ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ دہلی، لکھنؤ اور اہل زبان و نیاز مندانِ لاہور کے قضیے بھی اسی بات کو سامنے لاتے ہیں لیکن پاکستان بننے

کے بعد یہ روایت صرف یونیورسٹی اور کالجوں کے مشاعروں میں نظر آتی ہے اور اس کی سب سے بڑی مثال اسلامیہ کالج لاہور کے وہ سالانہ مشاعرے ہیں جو ''شمع تاثیر'' کے نام سے معنون اور معروف ہوئے لیکن پھر جس طرح پاکستان میں ہر چیز کی نقل تیار ہو جاتی ہے، اسی طرح متشاعر طالب علموں نے دوسروں سے لکھوا کر انعام حاصل کرنا شروع کر دیا البتہ بیت بازی کے علاوہ طرحی مشاعرے (جن کی روایت بھی اب ختم ہو چکی ہے) اس کی خوب صورت مثال ہیں جن میں سب سے اچھی ''طرح'' اور اچھی غزل سن کر دوسرے شعراء اپنی غزلیں رکھ دیتے تھے اور مشاعرہ ختم ہو جاتا تھا۔ اس حوالے سے ایک دلچسپ واقعہ عرض کرتا ہوں کہ لکھنؤ میں ہر بار ایک ہندو شاعر مشاعرہ لوٹ لیتا تھا۔ لہٰذا منتظمین نے بہت سوچ سمجھ کر اپنی طرف سے مشکل مصرع ''اور وہ کافر ہیں جو قائل نہیں اسلام کے'' بطور ''طرح'' دیا۔ منتظمین کا خیال تھا کہ ہندو ہونے کے باعث یہ شاعر مجبور ہو جائے گا لیکن وہ واقعتاً ''اُستاد شاعر'' تھا لہٰذا مشاعرہ شروع ہوا اور طریقے کے مطابق ہندو شاعر کو سب سے پہلے موقع دیا گیا۔ اُس نے حاضرین کو ''پرنام'' کر کے غزل کا آغاز ہی طرحی مصرع سے کیا اور اپنا مطلع پڑھا لیکن پہلے یہ بات جان لیجیے کہ ہندوؤں کے ایک اوتار کا نام ''گھنشام'' ہے جس کے بال گھنگھریالے اور کان کے ساتھ ساتھ گھومتے ہوئے اُردو زبان کے حرف ''ل'' کی شکل بناتے ہیں۔ یہ بات واضح ہو گئی ہو تو پھر مطلع سنیے:

؎ لام کی مانند ہیں گیسو مرے گھنشام کے
اور وہ کافر ہیں جو قائل نہیں اس ''لام'' کے

یعنی شاعر نے لفظ ''اسلام'' کے دو ٹکڑے ''اس لام'' کیے اور بڑی ذہانت سے اپنے مطلب کے معنی نکال لیے۔ دیگر شعراء نے یہ کمال کی طرح اور شعر سنا تو پوری دیانت داری سے اپنی غزلیں رکھ دیں یعنی یہ بات تسلیم کر لی کہ ہم اس سے اچھی طرح

لگا سکتے ہیں اور نہ اس سے اچھا شعر کہہ سکتے ہیں۔ یہ بات سنتے ہوئے مذکورہ لڑکیوں کے علاوہ بائیں اور آگے پیچھے بیٹھے ہوئے طلبہ و طالبات بھی محظوظ ہو رہے تھے۔ ان کے چہروں سے حیرت ہویدا تھی لیکن ہال میں شدید شور و غوغا اس میں کھنڈت ڈال رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی لڑکی یا لڑکا مزید سوال کرتا، ہال کے لاؤڈ سپیکرز سے پروفیسر ڈاکٹر ذیشان اطہر کی آواز اُبھری۔ ذیشان اطہر کا معاملہ بہت دلچسپ ہے۔ یہ گزشتہ صدی کے آخری عشرے کے کسی جمعہ کو ایس ای کالج میں ہونے والے اُردو مجلس کے تنقیدی اجلاس میں تشریف لائے اور پروگرام کے مطابق اپنی سات آٹھ اشعار پر مشتمل غزل تنقید کے لیے پیش کی۔ بیس بائیس ناقدین میں سے شاید کسی ایک آدھ نقاد ہی نے ذیشان اطہر کی غزل اور ان کے اشعار کی تعریف کی ورنہ سبھی لوگ.....اللہ بھلا کرے..... اس طرح گفتگو کرنے لگے جیسے ذیشان نے شعر نہیں کہے بلکہ ''جرم'' کیے ہیں جن کی انھیں سزا ملنا چاہیے۔ پھر ایک وقت آیا کہ ذیشان اطہر کا شمار بہاول پور کے جدید ترین شعراء میں ہونے لگا بلکہ ابھی ایک دو سال پہلے شعبۂ اُردو و اقبالیات، اسلامیہ یونیوسٹی سے جن تین نوجوان اور جواں فکر شعراء پر تحقیقی مقالات لکھے گئے ان میں ذیشان اطہر بھی شامل ہیں لیکن یہ ذیشان کا اصلی پورا نام نہیں ہے۔ اس نام سے تو وہ پہچانے جاتے ہیں۔ ان کا اصل اور مکمل نام ابوذر منیر ذیشان اطہر'' ہے۔ یہ چار اپریل ۱۹۷۰ء کو قاضی منیر احمد کے ہاں پیدا ہوئے۔ ایم۔اے اُردو کے بعد اسلامیہ یونیورسٹی سے ایم۔فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں لیں۔ ایک عرصے سے بہاول پور کے قدیم انٹر کالج اور موجودہ پوسٹ گریجوایٹ کالج ون یونٹ میں مختلف درجے کے طالب علموں کو پڑھا رہے ہیں۔ اب تک ان کا ایک شعری مجموعہ ''اپنے خیمے اُٹھا کے چلتے ہیں'' چھپ چکا ہے۔ باقی تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی چیزیں منتظر اشاعت ہیں۔

آج کا مشاعرہ ذیشان اطہر کے لیے ایک امتحان کی حیثیت بھی رکھتا ہے کہ

یوں تو ہر آدمی ہر کام کرسکتا ہے لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ ہر شخص ہر کام نہیں کرسکتا بلکہ ہر آدمی اپنی صلاحیت اور ودیعت کردہ اُفتادِ طبع کے مطابق اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔ بہاول پور کے بڑے تعلیمی اداروں کے ادبی و علمی پروگراموں کے حوالے سے اب تک سعید سلطان، آغا صدف مہدی، ذیشان تبسم اور ریحان بن جاوید نظامت کے فرائض انجام دیتے اور کامیاب ہوتے رہے ہیں۔ یہ ذیشان بھی چھوٹے موٹے پروگرام تو بہت کر چکے ہیں لیکن یونیورسٹی میں دو ہزار افراد اور تقریباً پچاس شاعروں کے درمیان نظامت کا فرض پہلی مرتبہ انجام دیں گے۔ ابھی ذیشان کی آواز دبی دبی سی ہے۔ ویسے شور بھی بہت ہے اور شعراء بھی ایڈجسٹ نہیں ہو رہے جب کہ کیمرہ صرف ذیشان کو دکھا رہا ہے اور وہ مشاعرے میں شامل شعراء کا تعارف کرا رہے ہیں۔ ایسے میں نقیب مشاعرہ نے اپنی ایک غزل شروع کی ہے جس کا مطلع ہے:

؎ خود کو یوں ٹوٹ کے پہچانا ہے
آئینے تک نے بُرا مانا ہے

ذیشان مطلع پڑھ چکے تو حاضرین کی طرف متوجہ ہو کر انھیں شعر سننے کو کہا لیکن مجمع ان چیزوں سے بے نیاز اپنی دھن میں مست ہے۔ ذیشان نے اسی شور میں غزل مکمل کی۔

ایسے تیار ہوا بیٹھا ہوں
جیسے سچ مچ ہی کہیں جانا ہے
میرؔ کے شعر سناؤ صاحب
دل کی اک چوٹ کو سہلانا ہے
ایک تو دیر سے سمجھے ہیں تجھے
دوسرے دل کو بھی سمجھانا ہے

سانس لینا وہ سبق ہے ذیشانؔ
نیند میں بھی جسے دوہرانا ہے
خود کو یوں ٹوٹ کے پہچانا ہے
آئینے تک نے بُرا مانا ہے

غزل کے اشعار پڑھتے ہوئے ذیشان اطہر پر شاعر غالب آ گیا تھا اور وہ اپنے شعروں کو بہت لطف لے لے اور دو ہرا دو ہرا کر پڑھ رہے تھے۔ شعر پڑھتے ہوئے اُن کے ہاتھ متحرک ہو جاتے اور آنکھیں کھلتی اور بند ہوتی جاتی تھیں لیکن باقی وجود ساکن تھا۔ اپنی غزل سنا کر ذیشان نے پھر شعراء کی تعریف شروع کر دی اور بتایا کہ آج عظیم شاعروں کی کہکشاں اسلامیہ یونیورسٹی میں اُتری ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے صدر مشاعرہ سیّد تابش الوری کے بارے میں تعارفی جملے کہنے سے پہلے تمام شعراء کو خوش آمدید کہا۔ تابش الوری کے بارے میں بتاتے ہوئے انھیں بہاول پور کی شان، آن، سیاسی و سماجی رہنما اور تمغۂ امتیاز کا حامل کہا اور بتایا کہ آج کے اس مشاعرے کی صدارت سیّد تابش الوری فرما رہے ہیں (اسی دوران میں ذیشان نے اپنا چشمہ کئی مرتبہ اُتارا اور کئی مرتبہ لگایا) ان تقریبات کے چیئرمین بھی سیّد صاحب ہی ہیں۔ میں شاہ جی کی اجازت سے اس محفل مشاعرہ کا آغاز کرتا ہوں۔ (ایسے میں کیمرہ متحرک ہوا۔ ایک نظر مجمع پر ڈالی اور کرسیوں اور صوفوں پر بیٹھے شعراء کو دکھایا) اسی اثنا میں نقیب نے حمد و نعت کے شعر پڑھے۔

؎ طائروں کو اِذنِ سفر دیتا ہے
مانگتے ہیں تو دُعاؤں میں اثر دیتا ہے
جب انہیں یاد کیا جائے پریشانی میں
کوئی مشکل ہو بدل جاتی ہے آسانی میں

سب جہانوں کے لیے ، سوختہ جانوں کے لیے
آپؐ ہیں رحمتِ حق صورتِ انسانی میں
ہم نے سرکارؐ دوعالم کو سدا یاد کیا
غم کی تخفیف میں ، خوشیوں کی فراوانی میں

حمد ونعت کے بعد بطور نقیب مشاعرہ ذیشان اطہر نے اپنی غزل اس درخواست کے ساتھ شروع کی کہ میں ایک غزل پیش کر رہا ہوں۔ دیگر بہاول پوری شاعروں سے گزارش ہے کہ وہ بھی ایک ایک غزل پڑھیں تا کہ ہم مہمان شعراء کو زیادہ سے زیادہ سن سکیں۔ ذیشان کی غزل پیشِ خدمت ہے:

ے میں کیسے مانوں کہ از خود جہان بن گیا ہے
بنانے والا نہیں اور مکان بن گیا ہے
جو دیکھتا ہے ، وہ پھر دیکھتا نہیں مجھ کو
نجانے چہرے پہ کیسا نشان بن گیا ہے
کچھ اتنے قصے ترے نام سے ہیں وابستہ
کہ اب یہ لفظ نہیں ، داستان بن گیا ہے
یہ کیا کہ تو نے بھی پتھر اُٹھا لیا مجھ پر
یہ کیا کہ تو بھی مرا قدر دان بن گیا ہے
گزر گیا ہے وہ لہرا کے ایسے آنچل کو
کہ دن میں تاروں بھرا آسمان بن گیا ہے
فضائے عشق بھی جنت سے کم نہیں ذیشان
کہ مجھ سا بوڑھا جہاں نوجوان بن گیا ہے
میں کیسے مانوں کہ از خود جہان بن گیا ہے
بنانے والا نہیں اور مکان بن گیا ہے

یہ غزل واقعتاً اپنی لفظیات معنویت، آہنگ، صنائع بدائع اور مشکل ردیف و

قافیہ کی وجہ سے بہت اچھی غزل ہے لیکن ایک تو اب داد دینے کا طریقہ مفقود ہو گیا ہے کہ سامعین آہ و واہ اور ہائے وائے کی بجائے تالیاں بجاتے اور شعر سے لطف اندوز ہونے کی بجائے بے مطلب شور مچاتے ہیں۔ ایسے میں ساظر کو ایک شعری محفل یاد آ رہی ہے جو اکادمی ادبیات اسلام آباد میں ہو رہی تھی۔ افتخار عارف شعر سنا رہے تھے۔ ایک شعر میں واقعتاً حرف 'ز' پانچ چھ مرتبہ آیا۔ ایک پارکھ نے شعر میں 'ز' کی تکرار کی داد دی۔ افتخار عارف بھی بہت خوش ہوئے اور شعر کئی مرتبہ دوہرایا لیکن اگلے ہی شعر پر وہ بہت بدمزہ ہوئے کہ کسی سامع نے کہا واہ! 'ش' کی تکرار بہت اچھی ہے جب کہ سارے مصرع میں حرف 'ش' سرے سے تھا ہی نہیں۔ پھر اس سامع نے دو تین اشعار میں مختلف حروف کی ایسی مٹی پلید کی کہ افتخار عارف بدمزگی کے باعث شعری محفل چھوڑ کر اپنے دفتر میں جا بیٹھے۔ دوسری طرف شاعر بھی داد وصول کرنے کا قرینہ بھول گئے ہیں۔ ذیشان کا ہاتھ بھی داد وصول کرنے کے لیے بہ مشکل اُن کے سینے تک پہنچتا تھا۔ بہرحال اب ذیشان اطہر بہاول پور میں ٹیلنٹ کی تعریف اور اپنی مجبوری پیش کرتے ہوئے ''عاطف نصیر'' کو اس کا یہ شعر:

ے سامنے ہوتا ہوں وہ پھر بھی مجھے ردّ کرتا ہے
بعض اوقات تو آئینہ بھی حد کرتا ہے

پڑھ کر بلا رہے ہیں جب کہ عاطف نصیر سٹیج پر آ کر سب سے پہلے یہی شعر پڑھتا ہے۔ اس کے بعد اپنی درج ذیل غزل ذرا سہمے سہمے انداز میں پیش کرتا ہے:

ے دی گئی ہے وہ آنکھ ، جام ، قرار
آئیں اور پائیں خاص و عام قرار
عشق کی خوب صورتی دیکھیں
اس کی بے چینیوں کا نام قرار

ڈوبنے والوں کے اُبھرتے ہاتھ
پائے ہیں آخری سلام قرار
ایک تو کھل کے جی نہیں سکتے
اور پھر خود کشی حرام ، قرار

عاطف نصیر نے چار شعر سنائے اور ہر شعر میں ایک تصویر اور ایک منظر موجود ہے۔ ۲۸ فروری ۱۹۷۹ء کو بہاول پور میں پیدا ہونے والے اس نوجوان کے ان اشعار میں شعری پختگی جھلک رہی ہے۔ ان چار اشعار کے بعد عاطف نصیر نے ذیشان اطہر کی بار بار کی درخواست کے باوجود دوسری غزل شروع کر دی لیکن اب عاطف سنبھل چکے ہیں:

؎ شہر ویراں سہی ، اُجاڑ نہیں
دستکیں بند ہیں ، کواڑ نہیں
ٹھیک ہے بے ثمر شجر ہوں میں
لگ گیا ہوں تو اب اکھاڑ نہیں
آ بھی سکتا ہے کام ، وحشت میں
آخری خط سنبھال ، پھاڑ نہیں
میری تصویر مت حسین بنا
میری بد صورتی بگاڑ نہیں

عاطف نصیر جس جگہ جا کر بیٹھے وہاں منظر میں اُن کے پیچھے خورشید ناظر اور سیّد قاسم جلال تشریف رکھتے تھے۔ گویا محض اتفاقاً وہ سارے مشاعرے میں موجود بلکہ مشاعرے پر چھائے رہے۔ ذیشان نے عاطف کا آخری شعر پڑھ کر اُن کا شکریہ ادا کیا اور پروفیسر ڈاکٹر افتخار علی افتخار کو بلانے کے لیے اُن کا درج ذیل شعر پڑھا:

؎ جسے پایا تھا مشکل سے ، اُسے کھونا پڑا ہے
بہت ہنسنے کا سوچا تھا ، بہت رونا پڑا ہے

افتخار علی افتخار ۳۰ مارچ ۱۹۷۰ء کو پیدا ہوئے۔ اسلامیہ یونیورسٹی کے شعبۂ ابلاغیات سے ایم۔اے کیا پھر ایم۔اے اُردو کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد ایم۔فل اور پی ایچ ڈی اُردو و اقبالیات کی ڈگریاں اسلامیہ یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ ان کا شعری مجموعہ ''سب حوالے تری محبت کے'' کے عنوان سے ۱۹۹۵ء میں چھپا۔ آج کل ایس ای کالج بہاول پور میں درس و تحقیق کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ افتخار نے غزل سے پہلے ایک قطعہ پڑھا:

؎ میں بارگاہِ حسن میں جاؤں بھی تو کیوں کر
دامن میں مرے چاند نہ سورج نہ ستارہ
گردابِ گماں میں تھا خیالات کا بیڑا
یہ کس نے سرِ ساحلِ امکان اُتارا

ان دو اشعار میں کچھ حروف کی تکرار بہت بھلی لگتی ہے لیکن ذیشان تو اس لیے بھی حد سے زیادہ داد دے رہے ہیں کہ یہ اور افتخار کچھ دوستوں کے ساتھ ہر شام اکٹھے بیٹھتے، کھاتے پیتے، تاش کھیلتے اور شعر کہتے ہیں۔ ان اشعار کے بعد شاعر نے اپنی غزل شروع کی جس کے ہر شعر پر داد پائی:

؎ جسے پایا تھا مشکل سے ، اُسے کھونا پڑا ہے
بہت ہنسنے کا سوچا تھا ، بہت رونا پڑا ہے
میں راتیں جاگ کر اس کی حفاظت کر رہا ہوں
مرے آگے تمہارے حسن کا سونا پڑا ہے
ہماری جنگ ہے اپنے ہی جیسے آدمی سے
ہمیں خود آج اپنے سامنے ہونا پڑا ہے
تری خواہش میں جس نے اپنی ہستی تک مٹا دی

اسے کچھ سوچ کر تجھ سے جدا ہونا پڑا ہے
یہ رزم خیر و شر ہے چھوڑ کر ہر مصلحت کو
مجھے اب دوستوں کے روبرو ہونا پڑا ہے

افتخار علی افتخار نے اپنی غزل کے مطلع کا مصرع اوّل پڑھ کر غزل ختم کی تو افتخار کو داد دیتے ہوئے نقیب مشاعرہ نے نئے شاعر پروفیسر ڈاکٹر عاصم شجاع ثقلین دُرّانی کا تعارف کراتے، اُن کے شعبے اور ان کے شعری مجموعے ''کوئی روشنی مرا خواب کر'' کا ذکر کرتے اور اُن کا ایک شعر پڑھتے ہوئے انھیں بلایا۔ دُرّانی نے غزل سے پہلے درج ذیل تین شعر پڑھے:

؎ بھر چکے زخم نئی چوٹ سے چھل جاتے ہیں
یہ سرِ راہ جو بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں
یہ تو ہم ہیں کہ قدم رکھتے ہی جاں دے دی ہے
ورنہ تو پہلے پہل عشق میں دل جاتے ہیں
تیرے کاڑھے ہوئے پھولوں میں مہک رہتی ہے
ورنہ کپڑے تو کہیں اور بھی سِل جاتے ہیں

عاصم یہ شعر کسی صاحبِ ذوق کو دکھا لیتے تو شاید وہ انھیں آخری شعر پڑھنے سے منع کر دیتا یا ایک آدھ لفظ بدلنے کا مشورہ ضرور دے ڈالتا لیکن اب یہ باریکیاں کتنے لوگوں کو معلوم ہیں؟ جب کہ یہ مسئلہ بھی ہے کہ صرف ذوق کے سبب کسی لفظ کا قتل جائز نہیں اور لسانی ارتقاء کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جو کچھ کہا جائے اُس کو قبول کر لیا جائے یعنی ''اُردو معلّٰی اور اُردو محلّہ'' کا معاملہ درپیش ہے۔ بصورتِ دیگر عاصم درانی اُن شاعروں میں شامل ہیں جنھوں نے ایم۔اے کے دوران میں بہاول پور کے ایک بہت اچھے ترقی پسند شاعر ''نقوی احمد پوری'' پر تحقیقی مقالہ لکھا، ایم۔اے کے امتحان میں

گولڈ میڈل حاصل کیا۔ ایم۔فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں بھی شعری موضوعات پر حاصل کیں۔ یہ خود ۱۹۷۰ء میں پیدا ہوئے اور ان کا بہترین شعری مجموعہ ۲۰۰۷ء میں چھپ کر سامنے آیا جس میں بہت سے دلچسپ شعری تجربے بھی شامل ہیں۔ مثلاً ایک ہکلے شخص کی غزل۔ اس مشاعرے کی ابتدائی فہرست بنانے میں ڈاکٹر افتخار علی افتخار کے ساتھ یہ بھی شامل تھے اور افتخار علی افتخار اور عاصم درانی نقیب مشاعرہ سے دوستی کی نذر ہوئے ورنہ انھیں کہیں بعد میں پڑھنا تھا۔ بہرحال عاصم کی غزل پیش ہے:

؎ کبھی لیا ہو جو لہجہ بدل تو ثابت کر
کبھی پڑا ہو جو ماتھے پہ بل تو ثابت کر
یہ زندگی ہے ، ریاضی کا اِک سوال نہیں
ہے تیرے پاس کوئی اِس کا حل تو ثابت کر
مرے خلوص کا انکار کرنا ممکن ہے
مرے خلوص کا نعم البدل تو ثابت کر
ہمارے سامنے آ ، بیٹھ ، بول ، آنکھ ملا
وہ چور دل سے گیا ہے نکل تو ثابت کر
ربع صدی سے محبت نبھا رہا ہوں میں
گریز کا ہو کوئی ایک پل تو ثابت کر

عاصم کو ہر شعر پر داد مل رہی تھی۔ ہال میں بہت سے شور کے باوجود عاصم کی آواز غالب تھی اور اُس نے ہر شعر دو دو بار بہت اعتماد سے پڑھا۔ اسی اثنا میں کیمرہ عاصم درانی کے علاوہ سٹیج کے پیچھے بیٹھے خورشید ناظر کو دکھا رہا تھا البتہ جب درانی نے اپنی جگہ چھوڑی تو کیمرہ گھوم کر ذیشان اطہر کے علاوہ دیگر دو تین شعراء مثلاً اظہر فراغ وغیرہ کو بھی دکھانے لگا۔ اسی اثنا میں نقیب مشاعرہ بتا رہے تھے کہ ہمارے مشاعرے میں

تینوں زبانوں یعنی اُردو، سرائیکی اور پنجابی زبان کے شاعر شریک ہیں اور سرائیکی کی نمائندگی افکار علوی کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ذیشان نے افکار علوی کو بلایا جن کا تعلق گوہر والا ضلع بھکر سے ہے اور جو اپنی شاعری کے حوالے سے عطاء الحق قاسمی اور قوی خان تک سے داد پا چکے ہیں۔ دونوں حضرات کی داد کے مقاصد واضح ہیں۔ اسی اثنا میں کیمرے نے ہال کا منظر دکھانا شروع کر دیا جو سامعین و ناظرین سے بھرا ہوا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ تمام تقریبات میں مکمل شرکت کے باوجود شہری، تحصیلی، ضلعی اور ڈویژنل انتظامیہ مشاعرے میں شریک نہیں تھی۔ ساظر کو اسلامیہ یونیورسٹی کا وہ دن یاد آ گیا جب طنز و مزاح سیمینار کے لیے مشتاق احمد یوسفی آ رہے تھے اور ساظر سمیت ساری یونیورسٹی کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ انتظامیہ کی موجودگی میں طلبہ و طالبات کیوں کر مستفید ہو سکیں گے؟ لیکن پھر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ صدرِ پاکستان جنرل پرویز مشرف نے بہاول پور آنے کا پروگرام بنا لیا اور یوں ہر طرح کی سیاسی و انتظامی حکومتیں اپنی اپنی راہ پر لگ گئیں لیکن آج کا مشاعرہ تو صرف یونیورسٹی نہیں بلکہ پورے بہاول پور کا مشاعرہ تھا جب کہ سامعین کی پہلی صف میں صرف وائس چانسلر انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب تشریف فرما تھے۔ کیمرہ گھوما تو پتا چلا کہ مشاعرے میں جگہ نہ ہونے کے باوجود سامعین کی آمد کا سلسلہ جاری ہے۔ بہر حال ایک ہی حال اور لباس میں رہنے والے افکار علوی نے شعر خوانی کا آغاز کیا۔ داد ملنے پر وہ ماتھے تک ہاتھ لے جانے کی بجائے اپنے دل پر ہاتھ رکھتے۔ پہلے انھوں نے ایک سرائیکی قطعہ پڑھا:

؎ کل سرمایہ ہے میڈا میکوں تاں مانْ ہن تیئں تے
تیکوں تاں اس محبت وِچ ، ریا کاری وی ناں تھئی گئی
میں ٹوریا ہم تے ہر بندے دی اکھ وِچ نیر ہن غم دے
تیرے کولوں تے سائیاں موئی ، ادکاری وی ناں تھئی گئی

سرائیکی قطعے کے بعد انھوں نے ایک اُردو قطعے سے نوازا:

؎ ہم نے اک دوجے سے رو رو کے کئی عہد لیے تھے
اور وفاؤں کی ضمانت میں علم رکھا ہوا تھا
میں اُسے رانی ، مجھے راجا کہا کرتی تھی وہ بھی
ہم نے اک دوجے کی غربت کا بھرم رکھا ہوا تھا

آخری مصرعے پر میں نے خورشید ناظر کی طرف دیکھا لیکن وہ شعر سننے کی بجائے گفتگو میں مصروف تھے۔ قطعہ کی داد لے کر علوی نے اپنی ایک اُردو غزل شروع کی:

؎ تجربہ تھا سو دُعا کی تاکہ نقصان نہ ہو
عشق مزدور کو مزدوری کے دوران نہ ہو
میں اسے دیکھ نہ پاتا تھا پریشانی میں
سو دُعا کرتا تھا مر جائے ، پریشان نہ ہو
گاؤں میں دور کی سسکی بھی سنی جاتی ہے
سب پہنچتے ہیں بھلے آنے کا اعلان نہ ہو
ایک رقاصہ نے اک عمر یہاں رقص کیا
دل کی دھک دھک میں چھنن چھن ہے تو حیران نہ ہو
اب تعوذ کو بدل دینے میں کیا رائے ہے
جہاں شیطان لکھا ہے وہاں انسان نہ ہو
شکریہ مجھ کو نہ دیکھا ، مری مشکل حل کی
میری کوشش بھی یہی تھی ، مری پہچان نہ ہو

غزل کے ختم ہونے پر سارے ہال سے ''مُرشد مُرشد'' کی آوازیں بلند ہونے لگیں جب کہ انتظامی افراد میں سے کسی شخص نے افکار سے درخواست کی کہ وہ

یہ نظم نہ پڑھیں۔اب شاعر ایک مشکل کا شکار ہو گیا اور اس نے اپنی نظم پر خود سنسر شپ عائد کر دی اور پڑھتے ہوئے وہ مصرعے اور شعر حذف کر دیئے جو بظاہر درست نہیں تھے۔بہر حال نظم ''مرشد'' کے کچھ اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

مرشد پلیز آج مجھے وقت دیجیے
مرشد میں آج آپ کو دکھڑے سناؤں گا
مرشد ہمارے ساتھ بڑا ظلم ہو گیا
مرشد ہمارے دیس میں اک جنگ چھڑ گئی
مرشد سبھی شریف شرافت سے مر گئے
مرشد ہمارے ذہن گرفتار ہو گئے
مرشد بہت سے مار کے ہم خود بھی مر گئے
مرشد ہمیں زرّہ نہیں تلوار دی گئی
مرشد ہماری ذات پر بہتان چڑھ گئے
مرشد ہماری ذات پلندوں میں دب گئی
مرشد ہمارے پاس بس ایک شخص تھا
مرشد وہ ایک شخص بھی تقدیر لے گئی
مرشد خدا کی ذات پر اندھا یقین تھا
افسوس اب یقین بھی اندھا نہیں رہا
مرشد محبتوں کے نقائص کہاں گئے
مرشد مری تو زندگی برباد ہو گئی
مرشد ہمارے گاؤں کے بچوں نے کیوں کہا
مرشد تو آپ آ کے سا ڈا حال ڈیکھ ونج

مرشد ہمارا کوئی نہیں ایک آپ ہیں
یہ میں بھی جانتا ہوں کہ اچھا نہیں ہوا
مرشد میں جل رہا ہوں ہوائیں نہ دیجیے
مرشد ازالہ کیجیے دُعائیں نہ دیجیے

شاعری حروف والفاظ کے ذریعے انسانی حیات سے متعلق مسائل کا فن کارانہ اظہار ہے۔اس کے ذریعے معاشرتی اصلاح کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔شاعری مخصوص افراد کی مدح وذم کا ذریعہ بھی ہے۔شاعری دیگر فنونِ لطیفہ مثلاً تصویر کاری، بت گری، موسیقی اور نقاشی وغیرہ کا بدل بھی ہو سکتی ہے لیکن بے لگام پروپیگنڈہ شاعری نہیں ہوتا۔ فن شاعری،لفظیات،صنائع وبدائع اور روزمرہ ومحاورے کو بھی الگ کر دیجیے چلیں، یہ بھی مان لیا لیکن یہ تو معلوم ہو کہ مرشد کون ہے؟ اُس سے ہم کیا چاہتے ہیں؟ ہم پر کیا ظلم ہوا ہے اور کسی دور میں ہم خود بھی تو کسی کے آلۂ کار نہیں تھے یا یہ کہ ہم بے لگام آزادی اور ہر آئین وقانون کو ہوا میں اُڑا دینا تو نہیں چاہتے؟ نظم ''مرشد'' کے حوالے سے یہ بہت سے سوال نوابزادہ لیاقت علی خان وحسین شہید سہروردی سے لے کر میاں نواز شریف وپرویز مشرف تک ہمارا پیچھا کر رہے ہیں لیکن ہم ہیں کہ معاملات کو سلجھانے کی بجائے مزید اُلجھاتے جا رہے ہیں۔یہ سوال بھی بہت اہم ہے کہ آخر ہم اپنے ہی مقرر کردہ صدور وچیف سے کیوں اُلجھتے اور وہ ہمیں کیوں برطرف کرتے اور خلافِ آئین اقدام کرتے ہیں؟ پھر نظم میں کہیں ''مرشد'' سے التجائیں ہیں اور کہیں یہ التجا ''پروردگار'' سے ہے اور یوں لگتا ہے جیسے ''مرشد اور پروردگار'' ہم معنی لفظ بن گئے ہیں۔خیر یہ سوال تو عبث ہے کہ اس نظم کی ہیئت کیا ہے؟ البتہ یہ سوال اہم ہے کہ افکار علوی کو کس ذہنِ رسا نے بہاول پور کے ادبی وثقافتی میلے میں بلانے کی سعیٔ مشکور کی تھی؟

بہر حال افکار علوی کے بعد نقیبِ مشاعرہ نے اُردو و پنجابی کے نقاد، محقق اور

شاعر سجاد نعیم کو دعوتِ کلام دی لیکن اسی اثناء میں ڈیرہ غازی خان سے عزیز شاہد کی آمد کا اعلان ہوا جو براہِ راست ہال میں تشریف لائے تھے۔ بہرحال جامہ زیب اور جاذبِ نظر سجاد نعیم نے شاعر کے لیے مخصوص نشست پر آ کر اپنا کلام شروع کیا۔ انھوں نے سب سے پہلے ایک قطعہ عنایت کیا۔

؎ لہو دی ایتھے نہر بنا کے اوہدے وِچ فیر زہر بنا کے
ہُن پچھتاندے پئے آں لوکو پنڈ اپنے نوں شہر بنا کے

اک ہور قطعہ:

؎ جد وی دل دے بُوہے کھلے اکھیاں وِچوں موتی ڈُلّے
عشق وِچ مر کے جینا دسیا شاہ حسین تے بابے بلھے

دو شعر ہور:

؎ او میرے نالوں وکھ وی رینا چاوندا اے
پر کدرے کدرے نال وی بینا چاوندا اے
ہر اک ساہ نوں اوہدے ناویں لاچھڈیا
ویلا ساتھوں ہور کی لینا چاوندا اے

تین شعر غزل دے تے فیر اک نظم:

؎ سڑکاں اُتے بھجن لوگ اپنے آپ نوں لبھن لوگ
ظلماں خورے اناں کیتا کندھاں دے نال وجن لوگ
بدل جاندے نیں موساں وانگوں جیٹھ ، ہاڑ تے پھگن لوگ

اِک دوست دی فرمائش اے کہ نظم ''میرا گاؤں'' سناواں۔ پیش کرناواں۔

میرا گاؤں ایسا گاؤں ہے
جہاں کئی زمانوں کی جمی ہوئی کائی کو کھرچنے کا ارادہ کر لیا گیا

بیلوں کی جوڑیاں گڈے سے آخری مصافحہ کر چکیں
اسی موچی کی دکان پر رکھے ہوئے بنچ پر
صرف تین لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش رکھی ہے
حافظ عمر دین بغل میں امامت کی چھڑی دبائے
گاؤں سے دور بھاگ رہا ہے
قہقہے بکھیرنے والا تاج مراثی
اپنی زندگی پر ہنس رہا ہے
بابے گٹے شاہ کی درگاہ پر
دودھ پلانے کی رسم دم توڑ چکی ہے
بی بی سی سے نشر ہونے والی خبروں پر سے
گاؤں کے لوگوں کا اعتماد گھٹتا جا رہا ہے
مٹنے کے خوف سے
کچی دیواروں سے پکی دیواروں پر لکھے ہوئے لفظ
بارش کو ترس رہے ہیں
تلفظ کے ہیر پھیر نے
میرا ذخیرۂ الفاظ کم کر دیا ہے
تاش کھیلنے والے آٹھ بوڑھے ہاتھ آخری بازی ہار چکے ہیں

آخری مصرع عطا کرتے ہی سجاد نعیم نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔

بہاول پور بجا طور پر اظہر فراغ پر مان کر سکتا ہے کہ وہ اس عمر میں اپنے بہت سے ہم عمروں کو پیچھے چھوڑ کر ملکی اور اردو سرحدوں سے بہت دور آگے نکل گیا ہے۔ جب یہ اعلان ہوا اور تبھی پتا چلا کہ آج کے مشاعرے کے مہمانِ خصوصی اسلم انصاری بھی آ گئے

ہیں۔ وہ تشریف لائے اور سٹیج کے مرکزی صوفے پر تشریف فرما ہوئے جب کہ اظہر فراغ کے عقب میں قاسم جلال، خورشید ناظر اور عزیز شاہد نظر آ رہے تھے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اظہر فراغ اس مشاعرے میں غالباً سب سے کم عمر شاعر تھے۔ ان کا مولد بہاول پور نہیں ساہی وال ہے لیکن اب یہ بہاول پور کے مستقل رہائشی ہیں۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ آج مشاعرے میں تشریف لا اور مقررہ نمبر پر پڑھ کر اظہر فراغ نے ساظر پر شخصی اور ذاتی احسان کیا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اظہر فراغ کا ایک شعری مجموعہ ''میں کسی داستاں سے اُبھروں گا'' کے عنوان سے بہت پہلے شائع ہو چکا تھا جو بہت اچھے اضافوں کے ساتھ از سرِ نو ''ازالہ'' کے عنوان سے سامنے آیا۔ بہر حال اظہر فراغ نے بہت اطمینان سے پڑھنا شروع کیا۔ اُن کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

ے دیواریں چھوٹی ہوتی تھیں ، لیکن پردہ ہوتا تھا
تالے کی ایجاد سے پہلے صرف بھروسا ہوتا تھا
کبھی کبھی آتی تھی پہلے، وصل کی لذت ، اندر تک
بارش ترچھی پڑتی تھی تو کمرہ گیلا ہوتا تھا
جب تک ماتھا چوم کے رخصت کرنے والی زندہ تھی
دروازے کے باہر تک بھی منہ میں لقمہ ہوتا تھا

☆☆☆☆

ے وہ جو اک شخص مجھے طعنۂ جاں دیتا ہے
مر نے لگتا ہوں تو مرنے بھی کہاں دیتا ہے
تیری شرطوں پہ ہی کرنا ہے اگر تجھ کو قبول
یہ سہولت تو مجھے سارا جہاں دیتا ہے
تم جسے آگ کا تریاق سمجھ لیتے ہو

دینے لگ جائے تو پانی بھی دھواں دیتا ہے
ناروا لاکھ سہی اپنی امامت لیکن

☆☆☆☆

ے اس پہ واجب ہے جو صحرا میں اذاں دیتا ہے
جم کے چلتا ہوں زمیں پر جو میں آسانی سے
یہ ہنر مجھ کو مرا بارِگراں دیتا ہے
ہاں اگر پیاس کا ڈھنڈورا نہ پیٹا جائے
پھر تو پیاسے کو بھی آواز کنواں دیتا ہے

☆☆☆☆

ے شکر کرو تم اس بستی میں بھی اسکول کھلا ورنہ
مر جانے کے بعد کسی کا سپنا پورا ہوتا تھا
بھلے زمانے تھے جب شعر سہولت سے ہو جاتے تھے
نئے سخن کے نام پہ اظہر میر کا چربہ ہوتا تھا

☆☆☆☆

جب سرِ شام پذیرائی فن ہوتی ہے
شاہ زادی کو کنیزوں سے جلن ہوتی ہے
لے تو آیا ہوں تجھے گھیر کے اپنی جانب
آگے انسان کی اپنی بھی لگن ہوتی ہے

اظہر فراغ نے اپنا کلام دایاں بازو ہلا ہلا کر بڑے اعتماد اور اطمینان سے عنایت کیا اور پھر اچانک اپنی جگہ چھوڑ دی۔ تب مائیک دوبارہ ذیشان کو ملا اور انھوں نے بتایا کہ ہمارے آج کے مہمانِ خصوصی پروفیسر ڈاکٹر اسلم انصاری نے ہمیں جوائن کیا ہے۔ ہم انھیں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے خوش آمدید کہتے ہیں۔ اُن کے ساتھ جناب

زاہد فخری اور جناب سیّد سلیمان گیلانی نے بھی ہمیں جوائن کیا ہے۔ ہمارے جو مہمان شعراء لاہور سے تشریف لائے ہیں، انھیں بھی خوش آمدید اور ہمارے بہاول پور کی ایک خوب صورت شاعرہ محترمہ شگفتہ الطاف بھی تشریف لائی ہیں۔ میں انھیں بھی خوش آمدید کہتا ہوں اور اب جیسا کہ میں نے آپ سے کہا تھا کہ شعراء تقدیم و تاخیر اور حفظِ مراتب کے حوالے سے حساس ہوتے ہیں اور ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ انصاف کریں لیکن اگر کہیں ہم سے کوئی خطا اور غلطی ہو جائے تو اس کے لیے پیشگی معذرت اور اب میں ایک ایسے شاعر کو دعوتِ کلام دے رہا ہوں جس کے میں صرف دو شعر پڑھوں گا لیکن آپ ان اشعار سے شاعر کو خود بخود پہچان لیں گے۔ اس کے بعد نقیبِ مشاعرہ نے درج ذیل شعر پڑھے:

؎ اس کی شادی نہ ہونے کا باعث اُس کا ابّا تھا
سب حریان تھے، اُس نے ایسا ابّا کہاں سے لبا تھا

☆☆☆☆

؎ تمہارے پھپھا وہ گنجے والے، جو لے گئے تھے ادھار کنگھی
مہینا ہونے کو آیا ہے، نہ اُس نے دتّی نہ ہم نے منگی
یہ المیہ ہے کہ اُس کو ملنے میں جب کبھی لک لکا کے پہنچا
تو اُس کی دادی دمے کی ماری ہمیشہ ہی اوس وقت کھنگی

معروف کالم نگار، صحافی، سیاح اور سب سے بڑھ کر، خوب صورت شاعر جیسا کہ انھوں نے اُردو اور پنجابی کو مکس کر کے بہت خوب صورت لہجہ تخلیق کیا ہے۔ میری مراد ہے جناب خالد مسعود۔ اس تعارف کے اختتام پر ساظر سوچ رہا تھا کہ کیا یہ تعارف مکمل ہو گیا ہے۔ دراصل ساظر محمد زیارف کو جانتا ہے جس نے شعبۂ اُردو واقبالیات سے ۲۰۰۹ء۔۲۰۰۷ء کے تعلیمی سیشن میں علی اکبر عباس کی شخصیت اور شاعری پر ایم۔فل

کا مقالہ لکھا تھا۔ موضوع تو لے لیا لیکن زیارف پریشان تھے کہ وہ اس موضوع پر کیا اور کیسے لکھیں؟ اتفاق سے انھی دنوں ساظر ایک علمی ٹور کے ساتھ اسلام آباد اور شمالی علاقہ جات کی طرف گیا۔ زیارف نے اپنی مشکل کا ذکر کیا اور ساظر کے کہنے پر علی اکبر عباس سے ملاقات کا وقت لے لیا جو اُن دنوں پاکستان ٹیلی ویژن اسلام آباد میں خدمات انجام دے اور راول پنڈی سے مری کی طرف جانے والی سڑک کے قریب ایک آبادی میں رہتے تھے۔ یاد رہے کہ علی اکبر عباس معروف صحافی و کالم نگار نذیر ناجی کے چھوٹے بھائی ہیں جو تقسیم ہند اور قیامِ پاکستان سے قبل مشرقی پنجاب کی ریاست فرید کوٹ میں رہتے اور وہ زبان بولتے تھے جس میں سرائیکی، پنجابی، سندھی، ہندکو، ہریانوی اور دکنی زبان کا لہجہ اور ذخیرۂ الفاظ شامل ہے اور جو دہلی و لکھنؤ تک پہنچتے پہنچتے اُردو کہلانے لگتی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد علی اکبر عباس کا خاندان جھنگ میں آباد ہوا اور تعلیم و ملازمتوں کے سبب علی اکبر عباس مختلف شہروں میں رہے۔ ۲۰۰۷ء تک ان کی شاعری کے تین مجموعے چھپے۔ آخری مجموعے کا عنوان ''رچنا'' یعنی وہ دوآبہ ہے جو دریائے راوی اور چناب کے درمیان واقع ہے۔ ''رچنا'' کے دیباچے میں اشفاق احمد نے علی اکبر عباس کو نظیر اکبر آبادی سے مماثل شاعر کہا ہے جب کہ پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے اپنے دیباچے میں ''رچنا'' کو دورِ حاضر کے اہم ترین شعری مجموعوں میں منفرد اضافہ قرار دیا ہے۔ بہر حال ملاقات میں عمومی سلام و دُعا کے بعد ساظر نے علی اکبر عباس سے یہ سوال کر دیا کہ آپ اور خالد مسعود خان کے روابط کیسے اور کیوں کر ہیں؟ شاید وہ اس سوال کی توقع نہیں کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ پھر بولے کہ آپ نے یہ سوال کیوں کیا؟ پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بتانے لگے کہ ہمارے تعلقات بہت پرانے اور بہت گہرے ہیں۔ ہم نے بہت سا وقت اکٹھا گزارا ہے اور اُن کے ساتھ شعری موضوعات اور اسالیب پر بھی بہت بحث مباحثے رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا

کہ علی اکبر عباس اور خالد مسعود خان کے شعری منابع یکساں ہیں۔ بس وقت کی تبدیلی کے ساتھ خالد نے اپنے اسلوب میں انگریزی الفاظ بڑھا لیے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ خالد مسعود مکھی پہ مکھی مار رہے ہیں۔ دراصل ہمارے یہ شاعر پڑھے لکھے خاندان سے ہیں۔ ان کے والد گرامی عبدالمجید ساجد اقبالیات کے ضمن میں ''اقبال دی حیاتی'' جیسی سوانح عمری لکھ کر شہرت پا چکے ہیں جسے پنجابی زبان میں علامہ اقبال کی پہلی سوانح عمری ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ خالد مسعود خان نے بہاءُالدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے غالباً ایم۔اے انگریزی کیا تھا۔ اُس زمانے میں خالد مسعود خان یونیورسٹی کے رائٹ ونگ کے نڈر لیڈر کے طور پر معروف تھے۔ ان کی سیاسی سوجھ بوجھ، ذکاوت، حسِ ظرافت، طبعی شوخی اور ذہانت اُس وقت بھی ان کے حریفوں کو مشکل میں ڈالے رکھتی تھی اور اب بھی انہیں ہر محفل میں نمایاں رکھتی ہے۔ ساظر مزاحیہ شاعری کے ضمن میں انور مسعود کو اس عہد کا امام تصور کرتا ہے لیکن دو امور میں خالد مسعود کی اوّلیت کا قائل ہے۔ اکبرالہ آبادی کے بعد انگریزی الفاظ کا استعمال انور مسعود سے پہلے خالد مسعود نے شروع کیا۔ بہت سے معترض کہتے ہیں کہ انور مسعود کی بیشتر شاعری اُن کی پیش کش کے انداز کے سبب دل کش لگتی ہے جب کہ خالد مسعود خان تو مشاعرے یا یوٹیوب چینل پر بے حس و حرکت اور مسکراہٹ تک کے بغیر نظر آتا اور صرف اپنی فکر اور اسلوب سے سامعین کو متوجہ کرتا ہے۔ بہرحال خالد مسعود خان کے دل کش اشعار ملاحظہ کیجیے اور خالد کی زبان سے سنیے:

؎ ہم نے اُس کو گھنٹوں موٹی ویٹ کیا
تب جا کر موٹی نے اپنا ویٹ کیا
میں نے اُس کے، اُس نے میرے ابے کو
بھل بھلیکھے انڈر ایسٹی میٹ کیا

ایک چھوٹی سی نظم ہے۔ تین مصرعوں کی نظم۔ نظم کا عنوان ہے ''بات سے بات

نکل آتی ہے''۔ اب بات سے بات کیا نکلتی ہے۔ سنیے:

؎ ایک سہیلی نے بتایا، اُس کی گاڑی کھوتے سے ٹکرا گئی ہے
دو جی بولی، کھوتے سے اک گل یاد آئی جو بالکل ویسی ہے
خیریں صلا، اب تیرے شوہر کی طبیعت کیسی ہے؟

ایک قطعہ، یہ قطعہ بنیادی طور پر اگلی تین لائنوں کے لیے ہے لیکن انجوائے پیچھے والے کریں گے، ان شاءاللہ۔ قطعے کا عنوان ہے ''قدرِ مشترک'':

؎ عشق محبت اپنی ٹائپ کی وکھری ایک پسوڑی ہے
اس میں بندہ جیتا بھی ہے اور مرتا بھی رہتا ہے
رَن مریدی اور سرکاری نوکری ، اِکو جیسی ہے
بندہ روتا بھی رہتا ہے اور کرتا بھی رہتا ہے

☆☆☆☆

؎ بیٹھے بیٹھے اجّن چیتے نویں پسوڑی پڑ سکتی ہے
کالے پھونڈ کی خیر ہے لیکن شہد کی مکھی لڑ سکتی ہے
بیوی ایسا گورکھ دھندہ ہے جو پلّے پڑ نہیں سکتا
کل جس بات پہ خوش تھی، آج وہ اُسی گل پر لڑ سکتی ہے

''زوجہ ماجدہ پر شاعر ہمیشہ رکتا اور دیر تک سامعین کی حیرت سے لطف اندوز ہوتا ہے'':

؎ زوجہ ماجدہ وہ جاسوس ہے جو دو منٹ کے اندر اندر
دل کی ستویں تہہ کے اندر بیٹھی گل کو پھڑ سکتی ہے

اب دو چار غیر سیاسی چیزیں سناؤں گا:

؎ ووٹر بھانویں بھاڑ میں جائے لیکن ووٹ کو عزت دو
نواں بیانیہ اتنا پاپولر ہویا کہ معافی ہے

بنی گالہ والے پوچھتے پھرتے ہیں کہ رائے ونڈ میں
ووٹ کو اور بھی عزت دیں یا اتنی عزت کافی ہے

ایک بالکل مختصر سی نظم اور اس نظم کا کوئی عنوان نہیں ہے۔ اور اس کے سارے کریکٹر بالکل فرضی ہیں اور الحمدللہ اس میں کوئی کریکٹر ہے بھی نہیں۔

؎ بڑے اوکھے مسئلے کا مشکل سے ہم نے جو اک حل نکالا
تو اگے سے اس حل کے نخرے بھی دیکھو
لگا پوچھنے وہ ہو کے لال پیلا و کالا
مجھے کیوں نکالا ، مجھے کیوں نکالا

☆☆☆☆

؎ نہ کچھ کیتا ڈاکٹر نے ، نہ کم حکیم نے کیتا
کالے رنگ کو گورا چٹا ، فیس کریم نے کیتا
لارا لا کے ووٹ کی عزت کا جو لندن نس گئے
ان کو رج ذلیل و شرمندہ اس ترمیم نے کیتا
ساری پارٹی ایویں مفت میں بھیگی بلی بن گئی
آدھی کابینہ کو کانا ایک حریم نے کیتا

☆☆☆☆

؎ اس موسم برسات میں دیکھو ساڈے ساتھ کی ہویا
مینہ برسا تھا ادھا گھنٹہ ، کوٹھا دو دن چویا
پلٹ کے دلہا ایسا بھاگا پھر نئیں واپس آیا
صبح سویرے دلہن نے جب اپنے منہ کو دھویا
شادی والے دن کو لڑکی آخری بار تھی روئی
بعد میں لڑکا گُل حیاتی ، بانگیں مار کے رویا

؎ بیٹھ کر چوبارے پر ٹھنڈی آہیں بھرتا ہے
تم سے لاکھ چنگا ہے کچھ نہ کچھ تو کرتا ہے
لڑکیوں کو لڑکوں کے تاڑنے کی ریزن ہے
نیچرل سا مسئلہ ہے گھوڑا گھاس چرتا ہے

☆☆☆☆

؎ ہم کو ٹھنڈا میٹھا پالا ، بھیڑا لگتا ہے
جیویں کپاہ میں کٹا کالا ، بھیڑا لگتا ہے
سالم ٹانگا کر کے بندہ اس کے گھر جب پہنچے
اگے بوہے پر ہو تالا ، بھیڑا لگتا ہے
منڈے کھنڈے بیشک ہم کو چاچا تایا کہہ لیں
وہی کہے گر ہم کو لالہ ، بھیڑا لگتا ہے
ہم کو اس کی نکی سالی چنگی لگتی ہے
اس کا چپن کدو سالا ، بھیڑا لگتا ہے

اور تین شعر:

؎ دل میں میرے ہو گیا چیر کمینہ سا
نظر کا کھچ کے مارا تیر کمینہ سا
ویسے اس کا سارا ٹبر شہدا تھا
لیکن اس کا وڈّا وِیر کمینہ سا
دُرفٹے منہ رانجھے کی اس حرکت پر
اپنے ساتھ وہ لے گیا ہیر کمینہ سا
ماپے اس کے جیل بھجوانے لائق تھے
کڑی کو کڈ کے لے گیا پیر کمینہ سا

علامہ اقبال کی نظم ''جگنو اور بلبل'' گفتگو کرتے ہیں۔ ظاہر ہے جناب اقبال کے زمانے کے جگنو اور بلبل فلسفیانہ گفتگو کرتے تھے۔ آج کل کے جگنو اور بلبل..... ذرا گفتگو ملاحظہ کریں:

جگنو بولا لوفر پنچھی ادھی رات کو شاخ پہ بیٹھا اے
گھر جا کر توں سوں مر لے ، رات تے اتنی تتی کوئی نئیں
بلبل بولا ، گھٹیا کیڑے تجھ کو جگتیں سوجھ رہی ہیں
تیری دم پر یو پی ایس ہے ، ساڈے گھر میں بتی کوئی نئیں

بتایا گیا ہے کہ خالد مسعود خان طلبہ تنظیم کے رائٹ ونگ میں شامل تھے لیکن بعد میں بطور خاص نوے کی دہائی میں میاں نواز شریف کی سیاسی جماعت میں شامل ہو گئے لیکن وہاں سے مایوس ہو کر تحریکِ انصاف میں شریک ہوئے۔ اس حصے کے اکثر ''غیر سیاسی شعر'' اُن کی اسی سیاسی فکر میں تبدیلی کے مظہر ہیں۔ یہ مشاعرہ اس اعتبار سے بھی دلچسپ ہے کہ اس میں افکار علوی، طاہر شہیر، سلمان گیلانی اور خالد مسعود خان اپنی اپنی سیاسی جہتوں کی نمائندگی کر رہے ہیں۔

خالد مسعود خان کے بعد ذیشان اطہر نے نوجوانوں میں معروف ترین شاعر علی زریون کو دعوتِ کلام دی اور سچی بات ہے کہ اگر ساظر انتظامیہ کا حصہ نہ ہوتا تو اس صورتِ حال پر شدید احتجاج کرتا کہ عمر، تجربے، شاعرانہ عمر اور مقبولیت میں خالد مسعود اور علی زریون کا کوئی تقابل ہی نہیں ہے لیکن اب کیا کیا جائے؟ علی زریون اپنی جگہ پر تشریف فرما ہوئے تو کیمرے نے ہال کے مناظر دکھانے شروع کر دیئے۔ سٹیج کے تیسرے اور آخری حصے میں خواتین بیٹھی تھیں۔ اس لائن کے آخر میں پہلی رو کی آخری سیٹ پر پروفیسر ڈاکٹر میمونہ غنی تشریف فرما تھیں جو ایک آدھ ماہ پہلے ریٹائر ہوئی ہیں۔ ان کا شمار بھی اُن چند سینئر اساتذۂ کرام میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی ساری زندگی اپنے

شعبے اور اپنی یونیورسٹی کے لیے مخصوص کیے رکھی حالانکہ ان کے پاس کہیں بھی جانے کے بہت سے مواقع تھے۔ دوسرے اور درمیانی حصے کی پہلی لائن میں انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب اس طرح بیٹھے تھے کہ یونیورسٹی کا کوئی سینئر افسر مثلاً ڈین، رجسٹرار، خزانہ دار یا ناظم امتحانات اُن کے ساتھ نہیں تھا۔ پہلا حصہ اہلِ ذوق شہریوں، صحافیوں اور دیگر صاحبانِ علم کے لیے مخصوص تھا لیکن طلباء کی کثیر تعداد نے من وتو کی تمیز مٹا دی تھی اور سبھی ایاز و محمود ایک ہی صف میں کھڑے بلکہ بیٹھے تھے اور جنھیں کرسیاں نہیں ملی تھیں، وہ ہال کی سیڑھیوں، قدمچوں اور رہ گزاروں میں تشریف فرما تھے۔ علی زریون نے اپنے طور پر مجمع کی تعریف کی اور فرمایا کہ سامعین اتنی بڑی تعداد میں بہاول پور کے مشاعروں میں کبھی نہیں آئے ہوں گے اور یہ بہاول پور کی تاریخ کا سب سے بڑا مشاعرہ ہو گا لیکن انھیں کون بتائے کہ بہاول پور ایسا بنجر بھی نہیں ہے۔ بہاول پور کی تاریخ کا سب سے بڑا مشاعرہ تو ۱۹۴۳ء میں جنگِ عظیم دوم کے دوران میں منعقد ہوا تھا جو تین دن اور نو دس نشستوں پر محیط تھا۔ اس مشاعرے کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں برصغیر پاک و ہند کے سینکڑوں شاعر شامل تھے۔ شاعروں کا نام قرعہ اندازی کے ذریعے نکالا جاتا تھا۔ اس مشاعرے میں مولانا ظفر علی خاں، شیخ عبدالقادر اور عبدالرحمٰن آزاد جیسے معروف شاعر شامل تھے جب کہ سارا شہر اُن شاعروں کو دیکھنے اور سننے کے لیے اُمڈ آیا تھا لیکن ساظر نے مشاعرہ سنا یا دیکھا نہیں، بس تذکروں میں اس کا ذکر پڑھا ہے البتہ جو مشاعرہ ساظر نے سب سے پہلے بہاول پور میں سنا اور پڑھا تھا اُس کی صدارت محمود علی سابق وزیر و وزیرِ مملکت کر رہے تھے۔ مرحوم امجد قریشی اس کے نقیب تھے اور یہ مشاعرہ کئی گھنٹے چلا تھا۔ ساظر اُس مشاعرے کا ذکر بھی کرنا چاہے گا جو آرٹس کونسل بہاول پور نے کرایا تھا۔ اس میں کراچی سے لاہور و اسلام آباد تک کے سبھی بڑے شاعر شامل تھے اور عوام الناس کی کثیر تعداد نے اس مشاعرے میں شرکت کی تھی۔ ۱۹۸۶ء میں ایس ای

کالج بہاول پور کی سوویں سال گرہ کی تقریبات منعقد کی گئیں۔ان میں ایک مشاعرہ بھی شامل تھا جس میں شرکت کے لیے اُستادِ محترم عابد صدیق ملتان سے شعراء کی ویگن بھر کر لائے تھے۔اس مشاعرے کی دو باتیں بہت یادگار تھیں۔اوّل اس میں اہلِ شہر کی شرکت ، دوم یہ کہ ساظر نے ایک بدتمیز خاتون کی طرف سے ایک بہت سینئر اور معروف شاعر کی ایسی درگت بنتے دیکھی کہ شاعری ہی سے توبہ کر لی۔شاید یہ بات آج کے مہمانِ خصوصی اسلم انصاری کو بھی یاد ہو کہ اس بُرے موقع پر وہ بھی موجود تھے۔ بہاول پور کے دورِ جدید کے مشاعروں میں ایک مشاعرہ وہ بھی ہے جو دنیا کے اُس ادیب ومحقق کے اعزاز میں منعقد ہوا تھا جسے کچھ محقق ونقاد ''محبت کو ترسا ہوا'' شخص کہتے ہیں۔اتفاق سے یہ مشاعرہ اسلامیہ یونیورسٹی کے گھوٹوی ہال میں منعقد ہوا اور اس میں بہاول پور کے منتخب اور غیر متنازع شاعروں نے کم ازکم پانچ پانچ غزلیات ومنظومات عطا کی تھیں۔اہلِ بہاول پور اُس مشاعرے کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے جو منور جمیل قریشی نے ''ظہور نظر کانفرنس'' کے موقع پر کرایا اور جس میں احمد ندیم قاسمی جیسے بڑے ادیبوں اور اہلِ قلم نے شرکت کی تھی لیکن ساظر کی زندگی کا ہول ناک مشاعرہ وہ تھا جو غالباً ۱۹۸۷ء دسمبر کی ایک رات کو اولڈ کیمپس کے مرکزی گراؤنڈ میں منعقد ہوا تھا۔ساظر کو اچانک طلب کیا گیا اور بتایا گیا کہ شعبۂ اُردو واقبالیات کے سینئر ٹیچر انچارج کے طور پر فرائض انجام دینے کی پاداش میں رات کے مشاعرے کی نقابت اُسے کرنا ہے۔ساظر کو اچھی طرح یاد ہے کہ یہ جمعرات کی ٹھنڈی رات لیکن مشاعرہ بہت گرم تھا جس میں شہاب دہلوی، اسلم انصاری، جاں باز جتوئی، عابد صدیق اور سہیل اختر جیسے عظیم المرتبت شاعر موجود تھے جب کہ مشاعرے کی صدارت طفیل ہوشیار پوری کر رہے تھے۔مشاعرہ رات بارہ بجے کے بعد ختم ہوا اور ساظر اُستادِ محترم عابد صدیق کے ساتھ انھی کے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اپنے گھر پہنچا۔موٹر سائیکل کے باعث ساظر کو سردی لگ گئی اور زکام ہو گیا۔

ساظر مطمئن تھا کہ صبح جمعۃ المبارک ہے، چھٹی ہے اور ان شاء اللہ نمازِ جمعہ تک طبیعت بحال ہو جائے گی لیکن ابھی صبح کے آٹھ بھی نہیں بجے تھے کہ دروازے پر بیل بجنے لگی۔ ساظر نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ایک شہری ٹائپ صاحب کھڑے ایک بار پھر بیل بجانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ساظر نے دیکھا کہ سڑک پر ایک موٹر کار بھی کھڑی ہے، پوچھا ''صاحب! کیا بات ہے اور آپ کون ہیں؟'' وہ بولے ''میں صاحب کا نوکر ہوں اور یہ اُن کی گاڑی ہے اور صاحب آپ کو بُلا رہے ہیں''۔ساظر نے پوچھا ''بھئی صاحب! یہ صاحب کون ہیں جو ساظر کو صبح ہی صبح بُلا رہے ہیں؟'' کہنے لگے کہ معاملہ بہت جلدی کا ہے اور مسعود صاحب اے ڈی سی جی بہاول پور ہیں۔'' میں دوبارہ گھر میں گیا، برش کیا، وضو بنایا اور اپنے ساتھ کچھ پیسے لے کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔میں نے گاڑی کی سبز نمبر پلیٹ دیکھ لی تھی اور گاڑی میں بیٹھتے ہی ڈرائیور کو بھی پہچان لیا تھا کہ سیّد مسعود احمد شاہ بہاول پور کے بھلے مانس افسر تھے اور تین چار ہفتے پہلے شعبۂ اُردو واقبالیات میں تشریف لا کر اساتذۂ کرام اور طلبہ وطالبات کو اپنے خیالات، فکر اور شاعری سے نواز چکے تھے۔شاہ جی کی کوٹھی پر پہنچے تو ایک ملازم سیدھا ایک کمرے میں لے گیا جہاں شاہ جی کے ساتھ رات کے مشاعرے کے صدر طفیل ہوشیار پوری بھی تشریف فرما تھے۔ہیٹر کے سبب کمرے کا درجۂ حرارت بہت خوش گوار تھا۔شاہ جی نے چائے کا بعد میں پوچھا، پہلے یہ فرمایا کہ طفیل صاحب بیٹھے ہیں اور سہ پہر میں ان کی فلائٹ ہے۔اور ہاں پہلے یہ فرمائیے کہ آپ ناشتا کریں گے یا چائے لیں گے اور دیکھیے تکلف نہ کیجیے۔طفیل صاحب بولے ''شفیق میاں! مجھے میرا اعزاز یہ نہیں ملا۔آپ کو اس کا بندوبست کرنا ہے۔'' ساظر اس تقاضے پر سٹپٹا گیا اور پوچھا ''جناب! آپ سے مشاعرے کی بات کس نے کی تھی اور کیا طے ہوا تھا؟'' وہ فرمانے لگے کہ کوئی خان صاحب تھے، نام تو میں بھول گیا۔انھوں نے بات کی تھی اور انھی نے دو طرفہ ٹکٹ بھیجا تھا۔ساظر نے پوچھا کہ کوئی خط، دعوت نامہ یا

لفافہ ہے آپ کے پاس۔انھوں نے ایک بیگ میں سے لفافہ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا جس پر صاف طور پر پروفیسر منور علی خان، صدر شعبۂ تاریخ وڈی ایس اے کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔ساظر نے ٹکٹ طفیل صاحب کو واپس کیا لیکن لفافہ لے کر شاہ جی سے درخواست کی کہ مجھے وی سی ہاؤس تک پہنچا دیں۔انھوں نے ازراہِ مروّت فرمایا ''ڈاکٹر صاحب! یہ مسئلہ حل ہونے تک ڈرائیور اور گاڑی آپ کے ساتھ رہیں گے۔ساظر وی سی ہاؤس پہنچا تو وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک اپنے شاگرد اور یونیورسٹی کے سینئر ترین اُستاد پروفیسر ڈاکٹر الٰہی بخش جار اللہ ڈین فیکلٹی آف اسلامک لرننگ کے ساتھ بیٹھے ناشتا کر رہے ہیں۔انھوں نے ساظر کو بھی ناشتے میں شریک کیا اور چھٹی کے دن آنے کا سبب پوچھا۔ساظر نے وضاحت کرتے اور لفافہ دکھاتے ہوئے سارا قصہ سنایا تو ڈین صاحب فوراً بولے ''میاں! آپ بھی کیا سادہ آدمی ہیں۔بھلا ہم نے انھیں لاہور سے یہاں بلوا کر اُن کے شعر سن لیے تو اُن کے لیے یہ بات کافی نہیں ہے'' اور اب وی سی صاحب بھی اسی پر پکے ہو گئے۔ساظر کے اصرار پر وی سی صاحب نے پروفیسر منور علی خان کو بھی بلا لیا جو مختلف کالجوں میں اُستاد، پرنسپل اور ڈائریکٹر کالجز رہے تھے۔خدا کا شکر ہے کہ انھوں نے میری تائید فرمائی لیکن ڈاکٹر جار اللہ اپنی ضد پر قائم رہے۔آخر ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک نے اپنے دوست ڈاکٹر محمد اکرم شاہ سے فون کر کے پوچھا تو انھوں نے فرمایا کہ ملک صاحب! آپ شاعروں کو اعزاز یہ نہیں دیں گے تو وہ آئندہ کیوں آئیں گے؟ آخر وی سی صاحب کے حکم پر یونیورسٹی خزانہ دار کو بلایا گیا جنھوں نے کچھ لکھا پڑھی کر اور کرا کے تین ہزار روپے عطا فرمائے لیکن اس ساری بھاگ دوڑ میں دوپہر کے بارہ بج گئے البتہ طفیل ہوشیار پوری وقت مقررہ تک ائیر پورٹ جانے کے قابل ہو گئے۔

بہاول پور میں ریاست کے زمانے اور اُس کے بعد بھی تقریباً گھر گھر شعری

محفلیں جمتی اور مشاعرے ہوتے تھے البتہ کچھ محفلیں اور مشاعرے اپنے سامعین و شعراء یا منتظمین کے لیے یادگار کی سی حیثیت اختیار کر گئے۔مثلاً مجھے ایک شعری محفل یاد ہے جو بہاول پور کے پہلے کمشنر سیّد ہاشم رضا کے اعزاز میں منعقد کی گئی تھی۔ہاشم رضا نے یہ انوکھا کام کیا کہ ہر شاعر کو پڑھتے ہوئے روکتے اور کاغذ پر اپنے نوٹ لکھتے جاتے۔یہ ضیائی مارشل لاء کا زمانہ تھا۔ڈیرہ غازی خان سے آئے ہوئے ایک اُستاد شاعر مجید تمنا نے جو بہت موٹے اور بے ہنگم جسامت کے مالک تھے، پڑھنا شروع کیا اور سیّد ہاشم رضا نے قلم کاغذ سنبھال لیا اور مجید تمنا نے دیکھا تو شعر خوانی بند کر دی۔انھیں دوبارہ پڑھنے پر آمادہ کیا گیا۔وہ پڑھنے لگے تو سیّد ہاشم رضا نے پھر قلم سنبھالا اور مجید تمنا نے شعر خوانی پھر روک دی اور آخر کار وہ پڑھے بغیر شاعر کے لیے مخصوص نشست چھوڑ کر اپنی پرانی جگہ پر جا بیٹھے۔دراصل انھیں یہ مغالطہ ہو گیا تھا کہ سیّد ہاشم رضا سی آئی ڈی کے آدمی ہیں اور اسی سبب سے مجید تمنا کے شعر لکھ رہے ہیں جس کے باعث وہ کسی مشکل میں پڑ جائیں گے، لیکن ایک مشاعرے میں یہ بھی ہوا کہ سیّد آلِ احمد نے ظہور نظر کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ''ماما! یہ شعر آپ کے لیے ہے۔'' سیّد آلِ احمد نے شعر پڑھا تو ظہور نظر نے فوراً کہا ''بھانجے ناموزوں شعر میرے لیے'' اور یہ شعر واقعی ناموزوں تھا۔معلوم نہیں شاہ جی نے شعر کسی کم زور لمحے میں تخلیق کیا تھا یا اب شعر پڑھتے ہوئے کچھ بھول گئے تھے۔

بہاول پور کی بعض شعری محفلیں ایسی بھی ہیں جنھوں نے بہاول پور کی شعری و ادبی ہی نہیں معاشرتی و سیاسی زندگی کو بھی متاثر کیا ہے۔مثلاً ساظر کو سیّد میر ظفر زیدی کے ہاں ''بزمِ اُردو'' کی وہ نشست یاد ہے جس کی صدارت سیّد تابش الوری کر رہے تھے اور اسی دوران میں لاہور سے ایک بہت بڑی سیاسی شخصیت کا فون آیا۔یہ فون دو تین مرتبہ آیا اور اگر سیّد تابش الوری فون توجہ سے سن کر اپنی رائے بدل لیتے تو وہ پنجاب

کے گورنر، چیئرمین سینٹ یا صدر پاکستان تک کے منصب پر فائز ہو سکتے تھے۔

اسی طرح اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کی طرف سے ۲۰۱۴ء میں منعقد کی گئی ''اُردو کانفرنس'' ہے جو تین دن جاری رہی اور جس میں دنیا بھر کے اُردو ادیب و شاعر شریک ہوئے لیکن اس عظیم کانفرنس کا حاصل صرف ایک ''تمغۂ امتیاز'' رہا۔ اس کانفرنس کی آخری نشست ''وسیب بہاول پور'' میں مشاعرے کی صورت میں منعقد ہوئی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس مشاعرے کا کوئی صدر ہی نہیں تھا۔ ڈاکٹر محمد مختار بھی اپنی اُفتادِ طبع کے مطابق اور انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب کی طرح معاملات سے بظاہر بے تعلق کم نمایاں جگہ پر تشریف فرما تھے۔ دراصل ایک قصے نے منتظمین میں کھلبلی مچا اور انھیں ایک دوسرے سے ناراض و خفا کر دیا تھا۔ ہوا یہ کہ آسٹریلیا سے معروف شاعرہ نوشی گیلانی کانفرنس میں اچانک آ گئیں۔ اُن کی آمد اور موجودگی بہت سے منتظمین کو منظور نہیں تھی اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ نوشی کانفرنس میں شریک ہوں بطورِ خاص مشاعرہ پڑھیں جب کہ ایک آدھ شخص انھیں دعوت دینے کا مرتکب ہو چکا تھا۔ اس کش مکش نے سارے مشاعرے کو بدمزہ کر دیا۔ اس پر طرّہ یہ کہ بہت سے سینئر اور لبرل شاعر خانقاہ اور اوچ شریف کی زیارت گاہوں میں تشریف لے گئے اور وہ شراب علم و دانش و معرفت کے خم پہ خم لنڈھا کر گرتے پڑتے اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ مشاعرہ گاہ میں وارد ہوئے۔ بھلا ایسے میں انھیں شعر و شاعری سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ سو انھوں نے جیسے تیسے اپنی باری بھگتائی اور اپنی اپنی آرام گاہوں یا گیسٹ ہاؤس میں جا سوئے۔ اسی سبب سے یہ مشاعرہ بہت پھیکا اور ٹھنڈا رہا۔

اب علی زریون کو کیسے بتایا جائے کہ بہاول پور نے کیسے کیسے مشاعرے دیکھے ہیں۔ بہر حال علی زریون نے سب سے پہلے کیمپس میں آنے جانے والے لوگوں کے لیے ایک قطعہ عنایت کیا۔

انھوں نے فرمایا:

؎ اندر اندر جلنے والو ، جیتے رہو
ہجر میں آپ سنبھلنے والو ، جیتے رہو
کیمپس کی خالی سڑکوں پر شام کے وقت
تنہا پیدل چلنے والو ، جیتے رہو
ہم لوگوں کو دیکھ کے اک دوجے کے ساتھ
اے ہاتھوں کو ملنے والو ، جیتے رہو

☆☆☆☆

؎ چادر کی عزت کرتا ہوں اور پردے کو مانتا ہوں
ہر پردہ پردہ نہیں ہوتا ، اتنا میں بھی جانتا ہوں
میں نے اُس سے پیار کیا ہے ، ملکیت کا دعویٰ نہیں
وہ جس کے بھی ساتھ ہے ، میں اُس کو بھی اپنا مانتا ہوں
سارے مرد ہی اک جیسے ہیں تم نے کیسے کہہ ڈالا
میں بھی تو اک مرد ہوں ، تم کو خود سے بہتر مانتا ہوں

☆☆☆☆

؎ پیار میں جسم کو یک سر نہ مٹا ، جانے دے
قربتِ لمس کو گالی نہ بنا ، جانے دے
چائے پیتے ہیں کہیں بیٹھ کے دونوں بھائی
جا چکی ہے ناں تو بس چھوڑ چل آ ، جانے دے
تُو جو ہر روز نئے حسن پہ مر جاتا ہے
تو بتائے گا مجھے ، عشق ہے کیا ، جانے دے

☆☆☆☆

؎ حالت جو ہماری ہے ، تمہاری تو نہیں ہے
ایسا ہے تو پھر یہ کوئی گالی تو نہیں ہے
یہ تو جو اپنی محبت کا صلہ مانگ رہا ہے
اے شخص تو اندر سے بھکاری تو نہیں ہے
مجمع سے اُسے یوں بھی بہت چڑ ہے کہ زریون
عاشق ہے مری جان ، مداری تو نہیں ہے

علی زریون نے مشاعرہ چھوڑنا چاہا لیکن ''اور اور'' کی آوازوں نے انھیں دوبارہ بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ کہنے لگے۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، مجھے آج بھی بخار ہے۔ بہر حال آپ کی محبت ہے میں پیش کرتا ہوں۔ ''پنجابی سنیں گے آپ۔''

؎ تیکوں کیویں ڈساواں کہ عمراں توں لمبا تھکیڑا ہے کیا؟
توں سرائیکی نہیں جانتا ، رائیگانی نہیں جانتا

☆☆☆☆

؎ بات مقدر کی ہے ساری ، بخت کا لکھا مارتا ہے
کچھ سجدوں میں مر جاتے ہیں ، کچھ کو سجدہ مارتا ہے
صرف ہمیں ہیں جو تجھ پر پورے کے پورے مرتے ہیں
ورنہ کسی کو تیری آنکھیں ، کسی کو لہجہ مارتا ہے
عشق کے ہاتھوں مر کر دیکھو ، ایسا انوکھا قاتل ہے
زندہ کر کے رکھ دیتا ہے ، اتنا سوہنا مارتا ہے
وہ تو علی زریونؔ ہے بھائی ، اُس کی گلی کا بچہ بھی
بات ذرا سی غلط کرو تو منہ پر مصرع مارتا ہے

علی زریونؔ کے بعد بہاول پور کے ایک اور اہم، تازہ دم اور دو شعری مجموعوں ''تو بھی میں بھی'' اور ''اِک عمر کی مہلت'' کے خالق محمد افضل خان کو بلایا گیا۔ افضل خان

دس اکتوبر ۱۹۷۵ء کو بہاول پور میں پیدا ہوئے اور ان کا تعلق ایسے شعبے سے ہے جس کا کام بالکل غیر شاعرانہ ہے یعنی ہائی وے اتھارٹی میں ملازمت لیکن یہ اس کے باوجود شعر کہتے اور تنقید لکھتے ہیں۔ انھوں نے بہاول پور میں ''شعور'' کے نام سے ایک ادبی تنظیم بھی بنا رکھی ہے جس کے ہفتہ وار اجلاس منعقد ہوتے ہیں۔ ان پر شعبۂ اُردو و اقبالیات، اسلامیہ یونیورسٹی میں تحقیقی مقالہ بھی لکھا گیا ہے۔ یہ تشریف لائے اور بے حس و حرکت اپنی غزلیں بڑے اعتماد سے سنا کر اطمینان سے چلے گئے۔ پیش کردہ غزلیں اور اشعار درج ذیل تھے:

؎ مجھے رونا نہیں ، آواز بھی بھاری نہیں کرنی
محبت کی کہانی میں اداکاری نہیں کرنی
ہمارا دل ذرا اُکتا گیا تھا گھر میں رہ رہ کر
یونہی بازار آئے ہیں ، خریداری نہیں کرنی
ہوا کے خوف سے لپٹا ہوا ہوں خشک ٹہنی سے
کہیں جانا نہیں ، جانے کی تیاری نہیں کرنی
تحمل اے محبت! ہجر پتھریلا علاقہ ہے
تجھے اس راستے پر تیز رفتاری نہیں کرنی
غزل کو کم نگاہوں کی پہنچ سے دور رکھتا ہوں
مجھے بنجر دماغوں میں شجر کاری نہیں کرنی
وصیت کی تھی مجھ کو قیس نے صحرا کے بارے میں
یہ میرا گھر ہے ، اس کی چار دیواری نہیں کرنی

افضل خان کی دوسری غزل:

؎ جو یہ کہتے ہیں کوئی پیشِ نظر ہے ہی نہیں
کون سی ذات کے منکر ہیں ، اگر ہے ہی نہیں

پھر جو اس شہر میں آنا ہو تو ملنا مجھ سے
گھر کا آسان پتا یہ ہے کہ گھر ہے ہی نہیں
اس لیے ہم کو نہیں خواہشِ حورانِ بہشت
ایک چہرہ جو اِدھر ہے ، وہ اُدھر ہے ہی نہیں
بے ارادہ ہی ترے پاس چلا آیا ہوں
کام کچھ ہو تو کہوں تجھ سے ، مگر ہے ہی نہیں
لفظ سے لفظ مجھے جوڑنا پڑتا ہے میاں
میری قسمت میں کوئی مصرعِ تر ہے ہی نہیں
چھپ کے کرتا ہے کوئی میری ورق گردانی
میں نے رکھا تھا جہاں مور کا پر ، ہے ہی نہیں

نقیبِ مشاعرہ نے نوشی گیلانی کا ذکر کرتے ہوئے مشاعرے میں شامل واحد خاتون شاعر محترمہ شگفتہ الطاف کو دعوتِ سخن دی جو یکم اکتوبر ۱۹۶۷ء کو بہاول پور ہی میں پیدا ہوئیں۔ یہیں کے سکولوں، کالجوں سے تعلیم حاصل کرتے ہوئے ۱۹۸۹ء کے سیشن میں انھوں نے ۱۹۹۱ء کے امتحان کے لیے مقالہ برائے ایم۔اے بہ عنوان ''نسیم حجازی بطور مزاح نگار'' تحریر کیا اور امتحان میں سب سے اچھے نمبر حاصل کر کے گولڈ میڈل کی حق دار ٹھہریں۔ شگفتہ الطاف ایم۔اے کر کے ایک عرصے تک علمی منظر سے غائب رہیں، پھر اچانک پی ایچ ڈی کے لیے طلوع ہوئیں لیکن ان کے ذاتی مسائل ان کی راہ روکتے رہے۔ ایک دو موضوع پر کام اسی سبب سے چھوڑنا پڑا۔ آخر کار ایک موضوع بورڈ آف سٹڈیز سے منظور ہوا لیکن ریسرچ بورڈ سے اس لیے منظور نہ ہو سکا کہ ہائر ایجوکیشن کمیشن سے پی ایچ ڈی سے پہلے ایم۔فل کی لایعنی شرط لگ چکی تھی جس کی زد میں ان کے علاوہ عاصم درانی بھی آئے۔ بہر حال شگفتہ کی پی ایچ ڈی رہ گئی لیکن ان کا خوب صورت

شعری مجموعہ ''ساحلوں پر بھیگتی آواز'' شائع ہوا۔ شگفتہ الطاف اپنی شاعری کی طرح سلجھی ہوئی خاتون ہیں اور اُس کا اظہار اُس دورانیے میں بھی ہوتا رہا جس میں وہ اپنا کلام سناتی رہیں۔ بہر حال شگفتہ الطاف کے شعر اور گفتگو ملاحظہ کیجیے:

''بہت دنوں بعد یونیورسٹی کے اس قدر خوب صورت مشاعرے میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میں یہاں پر نوجوان طالبات اور ینگ سٹوڈنٹس کے حوالے سے ایک نظم پیش کرنا چاہوں گی:

ے دھوپ میں اوس برستی ہے
ایک سمے تو ٹوٹ کر اُس پر پیار آتا ہے
جب غصے میں اُس کا چہرہ جلتا ہے
میرے ہرجائی کی آنکھیں
تب بھی ہنستی رہتی ہیں

اب ایک غزل کے کچھ اشعار پیش کروں گی:

ے انکار اپنی ذات سے کرنے نہیں دیا
اک شخص نے مجھے کبھی مرنے نہیں دیا
دیوانگی کے خوف سے رکھا شعور میں
دشمن نے ایک بار بھی مرنے نہیں دیا
اک منفرد مزاج نے پلکیں بچھائیں اور
پاؤں مجھے زمین پہ دھرنے نہیں دیا
میں مٹھیوں کی ریت تھی ، پل میں بکھر گئی
وہ خوش تھا اُس نے مجھ کو بکھرنے نہیں دیا

ایک اور غزل کے کچھ اشعار، آپ کی توجہ چاہوں گی۔ نوجوان نسل کے لوگ

یہاں بیٹھے ہیں:

؎ مجھے مرے خدوخال دے گا ، کوئی تو ہوگا
مرا سراپا اُجال دے گا ، کوئی تو ہوگا
مرے شجر سے عذاب موسم کے زرد پتے
چرا کے دریا میں ڈال دے گا ، کوئی تو ہوگا
دیئے جلائے گا شب کے آسیبی موسموں میں
وہ کالے جادو کو ٹال دے گا ، کوئی تو ہوگا
مرے لبوں پر جمی ہوئی برف گفتگو کو
کبھی تو موجِ سوال دے گا ، کوئی تو ہوگا
میں کچھ بہاروں کی سازشوں سے خزاں ہوئی ہوں
مجھے گلابوں میں ڈھال دے گا ، کوئی تو ہوگا

ایک اور غزل سے دو تین اشعار پیش کروں گی:

؎ خوش بو بنا کے باغ کو ہم زاد کر دیا
کس نے دلِ تباہ کو آباد کر دیا
دہلیز پر ٹھہر کے لیا اُس نے میرا نام
اور واپسی کا حوصلہ برباد کر دیا

شگفتہ الطاف کے بعد لاہور سے تشریف لائے ایف سی کالج کے اُستاد کو زحمتِ کلام دی گئی جو ''دنیا نیوز'' کے پروگرام ''حسبِ حال'' میں ''عزیزی'' کی پیش کردہ شاعری کے سبب معروف اور غالباً یہ اُردو شاعری کے موجود دور کے دوسرے شاعر ہیں جو اپنا کلام سناتے ہوئے انور مسعود کی طرح خود بھی سامعین سے زیادہ محظوظ ہوتے، ہنستے ہنساتے آنکھیں مٹکاتے اور ہاتھوں کو چلاتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر طاہر شہیر نے آتے

ہی سامعین کو ''السلام علیکم'' کہا اور فرمایا ''اب مجھے اندازہ ہوا کہ میں بہاول پور میں آیا ہوں۔ آغاز کرتا ہوں شادی شدہ حضرات کے لیے دو اشعار سے۔ پھر نوجوانوں کی طرف آؤں گا:

؎ بیگم ہاتھوں ''بست'' جو اکثر ہوتے ہیں
ہر پاسے ایسے ای شوہر ہوتے ہیں
باہر چاہے جتنے پھنّے خان بنیں
گھر میں سب ''لاہور قلندر'' ہوتے ہیں

ایک دو منظر مزید دیکھیے۔ ابھی خالد (مسعود خان) بھائی نے دو غیر سیاسی شعر سنائے۔ میں بھی دو غیر سیاسی شعر آپ کی نذر کرتا ہوں:

؎ وہ کہتا تھا دوں گا کبھی نہ این آر او
یہ کہتے تھے لوں گا کبھی نہ این آر او
پھر میدان میں اُترا اُن کا چھوٹا برو
یا فیر دیو دُعاواں سب ''مولانا'' کو
ایسا کیا حساب لگا کر عمدہ شو
اکڑ دکڑ پمپے پو ، اسّی نوے پورے سو

اور ان کے بارے میں ایک لیڈر کہتا ہے:

؎ یہ سارے تو کٹھ پتلی ہیں ، اصلی لیڈر سمجھاتا ہے
جب زیادہ بارش ہوتا ہے تو زیادہ پانی آتا ہے

ایک اور منظر نامہ دیکھیے:

؎ چھوڑو! عشق میں کیا رکھا ہے ، سیکنڈ آپشن عمدہ ہے
ورنہ محبوبائیں بن کر لڑکیاں ٹھگنے لگتی ہیں

حسن ، جوانی ، زلفیں ، آنکھیں ، سب بے کار کی باتیں ہیں
بس اک ٹیکا لگتے ہی سب حوریں لگنے لگتی ہیں

پچھلے دنوں ایک ڈرامے کا بڑا چرچا ہوا ''میرے پاس تم ہو'' ابھی تک بہت سے لوگوں کو ''دانش'' کے مرنے کا دکھ ہے۔ بہت سے لوگوں کو ''مہ وش'' کا اکیلا پن کھائے جا رہا ہے لیکن اس ڈرامے میں ایک کردار بہت مزے کا تھا رومی۔ ایک چھوٹا سا بچہ رومی۔ میں نے اُس کے لیے کچھ شعر کہے:

؎ رومی کے جملوں سے لگتا تھا ، سقراط کا نانا ہے
یا پھر عاشق ، اس سے لو لیٹر لکھوایا کرتے تھے
ہر ابو کی خواہش ہے کہ میرا ایسا بیٹا ہو
ورنہ بچے ہی تو موقع پہ پھنسوایا کرتے تھے
پاپا کی سیٹنگ کروائی تھی اس نے جس اتج میں
ہم سیمنٹ چاٹا کرتے تھے یا مٹی کھایا کرتے تھے

ایک غزل نوجوانوں کے لیے۔ اب آپ کی طرف آتے ہیں:

؎ لوگ سمجھتے ہیں کہ سانوں ، یار جدائیاں مار گئی آں
او ایتھے نویں سمسٹر دیاں ، فیر پڑھائیاں مار گئی آں
جینوں نقل کرائی ، اوہدے میتھوں بہوتے نمبر سن
یعنی میرے پیپر نوں تے ، صرف بھلائیاں مار گئی آں
جینوں ویکھاں ، سجن کہیندے ، اوں ہوں! تیری پا بھی اے
او دل نوں تکو ، اے ساری بھرجائیاں مار گئی آں
ایڈے کالے نئیں ساں ہونا ، دُھپے بُہتا پھر بیٹھے
او ساڈی ساری بیوٹی نوں ، جون جولائیاں مار گئی آں
پورا مہینا ڈائٹنگ کر کر ڈھڈ نوں ، ڈھڈی کیتا سی

اوتے تھلے ویاہ بھگتائے ، مٹن کڑاہیاں مار گئی آں
جب بیگم کا میک اپ اُترا .....

میں ایک میڈیکل کالج میں مشاعرہ پڑھ رہا تھا۔ تو سٹوڈنٹس ہر شعر پر ''ہائے''، ''ہائے'' کا شور کرنے لگے۔ ہر مصرعے پر یہ صورتِ حال ہوگئی کہ شعر پڑھنا مشکل ہو گیا میرے لیے۔ تو میں نے وہاں ایک نوجوان کے لیے جو زیادہ ''ہائے ہائے'' کر رہا تھا، فی البدیہہ شعر پڑھا:

؎ اج دے دن دا ایہو ای سچ اے ، بندہ کھچ اے
شور و ہاسا جانا مچ اے ، بندہ کھچ اے

اس پر اُدھر خاموشی ہوگئی لیکن اب یہی کام لڑکیوں نے شروع کر دیا تو وہیں دو شعر کہے:

؎ تیرے نخروں سے نئیں کام اے ، ہن ارام اے
دل تیری سہیلی دے نام اے ، ہن ارام اے
جس کو سمجھا عشق میں رو رو پاگل ہو گئی
اُس کو نکلا صرف زکام اے ، ہن ارام اے

پھر واپس آتے ہیں ''بیگم'' والے شعر کی طرف:

؎ جب بیگم کا میک اپ اُترا ، مُک گئے ساڈے چا سارے
مکرن جوگے وی نہ رہ گئے ، چار گواہیاں مار گئی آں
لڑکوں کا تو حال نہ پوچھو ، ودھ تو ودھ نمونے سن
کج کرناں تے کھجل کیتے ، کج ہم سائیاں مار گئی آں
کلّی کلّی جان اے ساڈی ، لٹن والیاں بہتیاں سن
بے بی ڈول جے مگروں لتھی ، چٹیاں کلائیاں مار گئی آں

انھوں نے افکار علوی کی نظم ''مرشد'' کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ میں بھی اپنی شاعری کا آغاز ''مرشد'' سے کرتا ہوں:

؎ ''مرشد بگڑے کام بنا دے
بنا پڑھے ہی پاس کرا دے
کوّے بن کے پھرتے ہیں ہم
یونی فارم سے جان چھڑا دے
اسپیشل کینٹین کو فوراً
لیبریری کے ساتھ جگہ دے
تاکہ دونوں کام ہوں پورے
پڑھ بھی لیں اور عشق مزا دے
یہ سب ممکن نہیں تو بس اک
گرین بیلٹ تک پوائنٹ چلا دے''

وقت چونکہ محدود ہے۔ میں آخر میں ایک سنجیدہ غزل پر اختتام کرنا چاہوں گا پھر کبھی تفصیل سے سناؤں گا۔ اس وقت ایک مزاحیہ نظم ملاحظہ کیجیے:

؎ ایزی لوڈ روزانہ منگدی ، گل نئیں کردی
اے کیہڑی اے لو اسٹوری ، آئی ایم سوری
اونے پتھر دا سی نواں لوایا ڈیلا
جینوں سمجھیا ، اکھ بلوری ، آئی ایم سوری
لہوری لڑکے نے انکار کیا یہ کہہ کر
لڑکی کی ہے ناک پکوڑی ، آئی ایم سوری
میں آں مونجی دے اک دانے ورگا سُکا
توں ایں پنج چھ من دی بوری ، آئی ایم سوری

آپ نے جتنی محبت سے مجھے سنا ہے، میں اُس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ نظم بھی توجہ سے سنیے گا اور اس نظم کا موضوع ہمارے معاشرے کا نظرانداز کیا گیا کردار ''باپ'' ہے۔ ''ماں'' پر تو بہت کچھ لکھا گیا لیکن باپ کے کردار پر توجہ نہیں دی گئی۔ اس حوالے سے نظم پیش خدمت ہے۔

پہلے ماں کے حوالے سے ایک شعر دیکھیے:

؎ ازل سے تا ابد ، اتنی بڑی پہچاں نہیں ملتی
اُسے ناراض مت کرنا ، دوبارہ ماں نہیں ملتی

اور باپ کی عظمت کے حوالے سے نظم ہے:

؎ ''عزیز تر مجھے رکھتا ہے وہ رگِ جاں سے
یہ بات سچ ہے مرا باپ کم نہیں ماں سے
وہ ماں کے کہنے پہ کچھ رُعب مجھ پہ رکھتا ہے
یہی وجہ ہے ، مجھے چومتے جھجکتا ہے
وہ آشنا مرے ہر کرب سے رہے ہر دم
جو کھل کے رو نہیں پاتا مگر سسکتا ہے
جڑی ہے اُس کی ہر اک ہاں مری ہاں سے
یہ بات سچ ہے ، مرا باپ کم نہیں ماں سے
ہر ایک درد وہ چپ چاپ خود پہ سہتا ہے
تمام عمر وہ اپنوں سے کٹ کے رہتا ہے
وہ لوٹتا ہے کہیں رات دیر کو دن بھر
وجود اُس کا پسینے میں ڈھل کے بہتا ہے
پرانا سوٹ پہنتا ہے ، کم وہ کھاتا ہے

مگر کھلونے مرے سب خرید لاتا ہے
وہ مجھ کو سوئے ہوئے دیکھتا ہے جی بھر کے
نہ جانے سوچ کے کیا کیا وہ مسکراتا ہے
مرے بغیر ہیں سب خواب اُس کے ویراں سے
یہ بات سچ ہے ، مرا باپ کم نہیں ماں سے''

''باپ'' کے عنوان سے نظم مکمل کرتے ہی طاہر شہیر نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ تبھی ذیشان اطہر نے اعلان کیا۔ اب ہمارے ایک اور مہمان شاعر تشریف لا رہے ہیں، ان کے والدِ محترم بھی شاعر تھے لیکن نعت گو شاعر کے بیٹے نے اپنے لیے طنز و مزاح کا میدان چنا ہے۔ ان کے صرف ان دو اشعار سے آپ انھیں پہچان جائیں گے۔ شعر دیکھیے:

تھانہ ترا ، تحصیل تری ، کینٹ ترا ہے
پیسا ہو تو سب ملک ہی سرونٹ ترا ہے
کچھ حصہ تو ہے عام حسینوں کے لیے وقف
باقی کا یہ دل نائنٹی پرسنٹ ترا ہے

ان کا ایک اور شعر دیکھیے:

کوئکلی کوئکلی گریں سر سے جوئیں
جو زُلف اُس نے کھولی ، سلولی ، سلولی

تشریف لاتے ہیں جناب سیّد سلمان گیلانی.....لیکن یہ کیا؟ سلمان نے شاعروں کے لیے مخصوص جگہ پر بیٹھنے کی بجائے موونگ مائیک لیا اور سٹیج پر چہل قدمی شروع کر دی جس کے باعث سٹیج کا ساکن منظر متحرک ہو گیا اور سامعین و ناظرین قاسم جلال، خورشید ناظر اور عزیز شاہد کے علاوہ تمام شعراء کو دیکھنے لگے۔ ایسے میں سیّد سلمان گیلانی

فرمانے لگے ''وقت بہت گزر چکا۔ میرے بعد بہت سے معزز شعراءِ کرام بھی ہیں۔ میں مختصر پڑھوں گا۔، ان شاءاللہ۔ پہلے ذرا سنجیدہ سنیے۔ پھر مزاح کی طرف آؤں گا:

مسیں شراب میں اپنی بھگو کے آئے ہو
کہ آبِ شر میں جوانی ڈبو کے آئے ہو
یہ سرخ ڈورے یہ آنکھوں کا نم بتاتا ہے
تمھیں کسی سے محبت ہے ، رو کے آئے ہو

☆☆☆☆

اچانک اُس نے رُخ سے جب نقاب لفٹ کر دیا
تو میں نے آگے بڑھ کے اپنا ہارٹ گفٹ کر دیا
مجھے تو اُس کو پہلی بار دیکھ کے گماں ہوا
خدا نے جیسے چاند کو زمیں پہ شفٹ کر دیا

''چاند سے ایک قطعہ یاد آ گیا.....اجازت ہے''

اک چندا گوری میم سی ہم سائی ہے مری
میری دلی دُعائیں ہیں اُس میم کے لیے
کل اپنی ماں سے کہتی تھی چندا نہ کہہ مجھے
عمران خان مانگ نہ لے ڈیم کے لیے

''کوئی ایک مصیبت ہے یہاں پر۔۔۔۔ہم نوجوانوں کے لیے۔ ذرا سنیے'':

میں اُردو میڈیم تھا ، وہ انگریزی دان تھی
سب توڑ کر وہ پیار کے بندھن چلی گئی
میں لینگویج کا کورس یہاں سیکھتا رہا
گورے سے شادی کر کے وہ لندن چلی گئی

رَن مریدی کا ہمیں طعنہ دیا کرتے ہیں دوست
ہم فقیروں کا اثاثہ کوئی رَن سے بڑھ کے ہے
فوٹی کے جی سے وہ رَن ون فوٹی کے جی ہوگئی
نیب کہتی ہے اثاثہ آمدن سے بڑھ کے ہے

☆☆☆☆

شعر و سخن کی لذت کیا جانے خشک صوفی
نشہ جو گھاس میں ہے گھوڑے ہی جانتے ہیں
شوہر کے دل میں کیا ہے ، ہر بیوی کو خبر ہے
بیوی کا موڈ شوہر ، تھوڑے ہی جانتے ہیں
بے زوجگی کے مارے ، کیا کیا ہیں دکھ ہمارے
جوڑوں کا درد کیا ہے ، جوڑے ہی جانتے ہیں

''آنے والی حکومت ہر کام پچھلی حکومت پر ڈال دیتی ہے۔مہنگائی کیوں ہے،پچھلی حکومت کی وجہ سے۔کچھ میں بھی بتاؤں آپ کو؟''

پوچھا جو میں نے حال ہے کیسا جناب کا
بولے ، بدن میں درد ہے ، نزلہ ، زکام ہے
میں نے کہا کہ کیسا گزارہ ہے چل رہا؟
کہنے لگے گرانی سے جینا حرام ہے
میں نے کہا کہ بچے زیادہ کیے تھے کیوں؟
کہنے لگے یہ پچھلی حکومت کا کام ہے

''یارا ایک دفعہ سن لوٹائم تھوڑا ہے۔اس لیے دوبارہ دوبارہ نہ سنیے گا۔ عرض کرتا ہوں۔

دیکھ کر داڑھی مری تو مجھے مُلّا نہ سمجھ
میرے سر پر میری ٹوپی کے اضافے کو نہ دیکھ

ظاہری حلیہ مرا تک کے پریشان نہ ہو
میرے مضمون کو پڑھ ، میرے لفافے کو نہ دیکھ

''ویسے بھی میں مولوی نہیں ہوں''

میں مولوی تو نہیں ، مولوی نما تو ہوں
نہ دے تو حلوہ مجھے روز ، فیرنی دے دے
ایک اور شادی کا مجھ کو بھی شوق ہے یارَبّ
نہ شاہ زادی کوئی دے ، فقیرنی دے دے
جو ایک دم سے مجھے ایک دم بنا دے وزیر
تُو میرے عقد میں ، اک ایسی پیرنی دے دے

☆☆☆☆

پرانا ہو گیا ہے ، داج میں آیا تھا بیوی کے
ارادہ کر رہا ہوں ، اب میں ٹی وی کے بدلنے کا
خدا نے آج تک اُس مرد کی بیوی نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی بیوی کے بدلنے کا

''یہ اگلی رو میں بیٹھے میرے دوستوں کے لیے'':

کل میں نے ایک دوست سے پوچھا کہ سچ بتا
میں نے سنا ہے بھابی کو ہے جن چمٹ گیا
وہ بولا خود ہی بھگتے گا جن ، میرا کیا قصور
پنگا تو جان بوجھ کے خود جن نے ہے لیا

☆☆☆☆

پوچھو اُسے ، جو میں نے کہا جانِ من ! سنو
حج کر کے آیا ہوں ، مجھے حاجی کہا کرو

وہ بولی حج کا ، اب یہ تقاضا ہے حاجی جی
اب جانِ من نہیں ، مجھے باجی کہا کرو

''فخری صاحب حج کر کے آئے۔فون آیا، کسی مشاعرے پر جا رہے تھے۔ کہنے لگے'' جانِ من! کی حال چال اے۔۔۔۔'' میں نے کہا'' فخری صاحب۔خدا کا خوف کرو۔ پانچ سات دن ہوئے ہیں حج سے واپس آئے ہوئے اور آتے ہی پھر وہی جانِ من''۔عمران بشیر صاحب نے کچھ فرمائشیں کی تھیں۔ان میں سے ایک یہ تھی:

؎ اک بچے سے پوچھا کیوں ہے شکل پہ یہ بدحالی سی
رات کو جاگ کے پڑھتے رہے ہو، آنکھوں میں ہے لالی سی
بچہ بولا ، چھوڑیں انکل ، جائیں ، اپنا کام کریں
میرے خیالوں پر چھائی ہے اک صورت متوالی سی
نازک سی شرمیلی سی ، معصوم سی ، بھولی بھالی سی
پڑھتی ہے اس کالج میں ۔۔۔۔ اتا پتا معلوم نہیں
کو کو کورینا ۔۔۔۔ کو کو کورینا ۔۔۔۔۔

''کہیں سے کچھ آواز آئی جس کے جواب میں سلمان گیلانی نے بچیوں کو سراہنا شروع کر دیا اور پنجابی زبان میں کہا کہ لڑکیاں ماشاءاللہ ہر میدان میں ترقی کر رہی ہیں۔بیٹیوں کے لیے کلیپ کرو۔''

؎ بیگم سے میں نے پوچھا ، کوئی میٹھی چیز ہے
حلوے کا اُس نے تھال ، میرے آگے کر دیا
بیٹی سے اپنی میں نے کہا ، میٹھا دو مجھے
جھٹ اپنا اُس نے گال میرے آگے کر دیا

سلمان گیلانی کہہ رہے تھے کہ آپ کی چھوٹی بہنیں ہوں گی، اُن سے پیار کیا

کرو۔بہت مہربانی، بہت شکریہ۔ یہ کہہ کر سلمان سٹیج چھوڑ رہے تھے جب کہ ساظر بہت دیر سے کسی گہری سوچ میں ڈوبا میرؔ، غالبؔ اور اقبال یا فیض اور مجید امجد کی شاعری کے پس منظر میں مستقبل کی شاعری کا حلیہ بگڑتا دیکھ رہا تھا۔یہ اُردو شاعری کے نئے امکانات بھی ہو سکتے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر ذیشان اطہر نے نئے شاعر کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ''شوکت فہمی'' آج کل امریکہ میں مقیم ہیں۔اِن دنوں پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ بہت اچھا شعر کہتے ہیں۔میں ان سے درخواست کرتا ہوں کہ تشریف لائیں اور اپنے کلام سے نوازیں۔شوکت فہمی نے اپنی کئی غزلوں کے ٹکڑے اور قطعے ارشاد فرمائے اور ایک غزل سنائی۔ان کے اشعار پیشِ خدمت ہیں:

؎ آخری بس ہے اور نکلنے والی ہے
آ جاؤ ، اک سیٹ برابر خالی ہے
شہر کی حالت اتنی بھی مخدوش نہیں
دیکھو! میں نے آج بھی جان بچا لی ہے

☆☆☆☆

؎ بدلا جو وقت ، گہری رفاقت بدل گئی
سورج ڈھلا تو سائے کی صورت بدل گئی
اک عمر تک میں اُس کی ضرورت بنا رہا
پھر یوں ہوا کہ اُس کی ضرورت بدل گئی

☆☆☆☆

؎ اس طرح کے حریفِ سخت کے ساتھ
کون لڑتا ہے اپنے بخت کے ساتھ
وہ ضرورت تھی یا محبت تھی
بیل لپٹی رہی درخت کے ساتھ

ایک پرانی غزل کے دو تین شعر سنا کے اجازت:

یادوں کی اک ژالہ باری مجھ میں ہے
گزرا موسم اب تک جاری مجھ میں ہے
تم تو میرے حق میں کوئی بات کہو
تم نے تو اک عمر گزاری مجھ میں ہے
زخموں کی پوشاک بدلتا رہتا ہوں
اسی لیے تو تازہ کاری مجھ میں ہے

جہانگیر مخلص بہاول پور کے مقبول سرائیکی شاعر ہیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جب کہ ''ستلج'' کے حوالے سے ان کی نظم بہت معروف ہے۔ تشریف لاتے ہیں جہانگیر مخلص:

مُسافری

اَساں مُسافر ہیں یار ساڈی تاں کُل حیاتی مُسافری ھے
بھریسے شہر دے ہجوم وچ وی کلھیپ کاتی مُسافری ھے
بھلا ڈسیجے تاں کیا ڈسیجے جو گنگی ہاتی مُسافری ھے
اَساں تاں جھانجھر مثال سانول چا پیریں پاتی مُسافری ھے

مُسافری ھے مُسافری وچ حیاتی ساری گُزار سکدوں
سُتے سُتے ہوئے سُجاک یارو ، ایہ شہر کیویں وِسار سکدوں

اِتھاں کھلی چُون ، چُون چولی اِتھائیں ونگاں دے رنگ رہ گئن
اِتھاں میڈی سونہہ سُنجان رہ گئی اِتھاں میڈے انگ سنگ رہ گئن

اِتھائیں پلکاں پرون تھی گئن اِتھائیں ہنجواں دے ڈنگ رہ گئن
ایہو شہر ھے ، ایہے گلیاں ہِن ، جتھاں اساں جھمئیں ملنگ رہ گئن

اِتھاں میڈی سِک سراب رہ گئی اِتھاں میڈے خاب خاب رہ گئے
اَساں تیکوں کُھل کے مِل سگیے نی حجاب اونویں حجاب رہ گئے

بے پاوڑے لوک ہِن اِتھاں وی بے وارثا اونویں شہر ھے پیا
اندر دے جنگل وی جاگ پے ہِن ایں شہر تے اونویں قہر ھے پیا
اِتھاں تاں نانگیں دی جُوں بدل گئی مگر مزاجیں دا زہر ھے پیا
اَساں فقیریں تے سانولا اونویں رات دا پچھلا پہر ھے پیا

اساں تاں ہک بے سُنجان دھانھ ہیں نہ تیڈے ناں ہیں نہ کہیں دے نانویں
نمانی ہنجھ اے قبول کر گھِن الانویں بھانویں تے نہ الانویں

اِتھاں فقیریں دی فکر کیکوں اساں تاں اپنے دھیان وچ ہیں
نہ کہیں دے ہوٹھاں تے ذکر ساڈا نہ کہیں دے وہم و گمان وچ ہیں
جیویں لئیندے لُو اساکوں نہ ہُن کہیں دی امان وچ ہیں
اَساں تاں اندھیں اکھیں دی جھلمل اَساں تاں گنگی زبان وچ ہیں

اساڈا اپنا حوالہ کائینی بِگانی سُونہہ دے سراب وچ ہیں
ونجھے کئیں در تے دھانھ ڈیویجے اَساں تاں اونویں عذاب وچ ہیں

ایہ کینجھی نگری ھے میڈا سانول جو زندگی دا اَلا ای کائینی
نہ کوئی در ھے نہ کوئی ولیکھا نہ سُدھ سنہیا صدا ای کائینی
اِتھاں پُلوتے وی سُم گئے ہِن اِتھاں لباں تے دُعا ای کائینی
نہ رہ گئے ہُنڑ کہیں کوں مانڑ کہیں دا سُنجانڑ کیا کوئی گلہ ای کائینی

گلہ شریکیں دے نال ہوندے گلہ تاں یاریں دے نال کائینی
شریک چہرے وِگچ گئے ہِن اونویں تاں شیشے تے وال کائینی

ایہ کینجھی خلقِ خدا ھے یارو جنھاں دی اپنڑی سُنجانڑ کائینی
اِتھاں دیاں سوچاں صلیب چڑھ گن تے کہیں دے لب تے مُکانڑ کائینی
اِتھاں کوں مویاں دی مونجھ کائینی اِتھاں کوں جیونڑ دامانڑ کائینی
تے جنگلیں موئیں دے کہیں جنازے ایہ سچ ھے سکھڑیں اکھانڑ کائینی

اِتھاں دیاں وستیاں ویران تھی گن ، اِتھاں دے شہریں کوں شور کھا گئے
اِتھاں دے خوابیں دا ہر خزانہ ، اِتھاں دے اندر دا چور کھا گئے

نہ من دے ویڑھے دے سُکھ سنہیڑے ، اجاں تاں سمبریا ساج کائینی
اجاں تاں روح دے رُسیمے ہِن پئے ، اجاں تاں دِل دِی متھاج کائینی
اِتھاں تاں پُتریں دی روزی کائینی ، اِتھاں تاں دھیریں داڑاج کائینی
اِتھاں قلم دے وی سِر قلم ہِن ، اِتھاں الاونڑ رواج کائینی

اساں کوں سُدھ ھے ، اساں اَلیسوں تاں نال سانجھا شعور کھِلسی
توئے جو کنڈیاں دی شاخ ہوسی گلاب دا پھُل ضرور کھِلسی

تے اے وی سچ ھے جو انت ہک ڈینہہ وَل اپنڑے وطنیں فقیر وَلسن
نہ لب تے کوئی گُندر مُندر ہوسی نہ پیریں پا کے زنجیر وَلسن
او سینے اُتے سجا کے سجھ کوں ملوک من دے ملھیر وَلسن
تمام قبراں تے بال ڈیوے تے کُجھ وی تھیوے اخیر وَلسن

او اپنڑے اندر دی اُک توں اَک تے اکھیں توں ساونڑ نتار سگدن
او اپنڑے چُپ دی چِتا کوں ساڑن تاں لفظ سارے وِنگار سگدن

نہ کوئی مخلص سڈاوے اِتھ کے نہ کوئی ساکوں خطاب ڈیوے
اساں جھیں فطرت شناس لوکیں کوں بیا ہُنڑ نہ عذاب ڈیوے
جے تھی سگے تاں لباں تے سکدے سوال دا کوئی جواب ڈیوے
اساڈا ستلج وِکا گیا ھے اساکوں تریہہ دا حساب ڈیوے

اجاں تاں ویلے کوں دیر نئیں تھئی اجاں تاں غاصب سُنجانڑ وچ ھے
اساڈی بے انت روح دی روھی دا ذرّہ ذرّہ مُکانڑ وچ ھے

نقیبِ مشاعرہ ذیشان اطہر نے آنے والے شاعر کا نام پکارا تو ساظر چونک پڑا۔
یہ رب نواز کاوش تھے جنھوں نے ستمبر ۱۹۷۸ء میں اورنگ زیب عالم گیر، مشہود حسن رضوی،
انور صابر، جمیل اختر اور پروفیسر عابد صدیق کے ساتھ مل کر ادبی تنظیم ''اُردو مجلس بہاول پور''

قائم کی تھی۔ پھر انھوں نے ۱۹۷۹ء سے شروع ہونے والے شعبۂ اُردو و اقبالیات کے تیسرے سیشن میں داخلہ لیا جس میں ان کے معروف ہم جماعتوں میں سجاد شیرازی، ساجد درّانی اور نسیم خالد وغیرہ نمایاں رہے۔ انھوں نے اپنا ایم۔اے اُردو کا امتحان ایک حادثے کے سبب چوتھے سیشن کے ساتھ دیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ انھوں نے ایم۔اے اُردو کے لیے تحقیقی مقالہ بھی لکھا۔ ابتداء میں صادق پبلک سکول میں ملازمت اختیار کی لیکن جلد پبلک سروس کمیشن کے ذریعے گورنمنٹ کالجوں کے لیے منتخب ہو گئے۔ اسلامیہ یونیورسٹی ہی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی جس کا زبانی امتحان ڈاکٹر طاہر تونسوی مرحوم نے لیا تھا۔ یہ مقالہ بہت سی تبدیلیوں کے بعد اشاعت کا اعزاز بھی رکھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بہت سے تحقیقی مقالات بھی شائع ہوتے رہتے ہیں جو کبھی کبھی فرمائشی اور غیر حقیقی بھی ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر نواز کاوش کا شعری مجموعہ ''محبت کام آئے گی'' بھی شائع ہو چکا ہے۔ یوں نواز کاوش شعری و تحقیقی مزاج کے حامل شخص ہیں۔ بہر حال یہ تشریف لائے اور آتے ہی اپنا کلام ان اشعار سے شروع کیا:

ے ہجر کی داستاں سناتے ہوئے
رو پڑا وہ گلے لگاتے ہوئے
عشق میں زہر کا پیالہ بھی
پینا پڑتا ہے مسکراتے ہوئے
موسموں کی نظر نہ لگ جائے
بارشوں میں اُسے نہاتے ہوئے

اور یہ شعر دیکھیے:

ے کتابیں ، پھول ، خوش بو اور محبت ساتھ رکھتا ہوں
جہاں جاؤں میں اپنی ہر ضرورت ساتھ رکھتا ہوں

اسی عادت نے مجھ کو رائیگانی سے بچایا ہے
میں خود جیسا بھی ہوں ، اچھی رفاقت ساتھ رکھتا ہوں
کسی دن شام سے پہلے نکل آؤ مری جانب
بہت مصروف ہوں لیکن فراغت ساتھ رکھتا ہوں
کہیں جانا پڑے تو دل ہی رستہ روک لیتا ہے
میں ہجرت کی اگرچہ اک روایت ساتھ رکھتا ہوں

ڈاکٹر نواز کاوش اُٹھے تو ڈاکٹر ذیشان اطہر نے فرمایا کہ آنے والے شاعر کی شناخت طنز و مزاح ہی ہے لیکن مجھے اُن کا سنجیدہ شاعری والا رنگ زیادہ پسند ہے۔ میں زاہد فخری کو زحمتِ کلام دیتا ہوں۔ زاہد فخری اپنا نام سن کر پہلے ہی چوکنے ہو گئے تھے۔ اب شاعر مخصوص نشست پر تشریف لائے، بیٹھتے ہی دونوں بازو اُٹھا کر نوجوان سامعین کو داد دی اور ہنستے ہوئے فرمایا ''ایسے خود غرض موسموں میں جہاں گھر کی تختی سچ بولتی ہے اور نہ قبر کا کتبہ سچی بات بتاتا ہے، وہاں میرے دوست اطہر صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنے عہد کی آوازوں کو بہاول پور میں جمع کیا۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ درختوں کو اکھڑتے، شہروں کو اُجڑتے اور ملکوں کو ٹوٹتے ہوئے دیکھ کر کوئی نہیں روتا تو شاعر روتا ہے۔ اس لیے کہ ادیب و شاعر ہی بہتر اور خوش حال معاشرے کا خواب دیکھتے ہیں۔ میں آج کے نوجوان کو دیکھتا ہوں تو پاکستان کا مستقبل بہت روشن نظر آتا ہے۔ آپ نے سلمان گیلانی کا مزاح سنا۔ گیلانی صاحب سے میری بڑی پرانی دوستی ہے۔ کسی محفل میں بات ہو رہی تھی تو صاحبِ صدر نے قومی و اخلاقی انحطاط کے بارے میں گیلانی صاحب کی رائے پوچھی تو انھوں نے کہا کہ آپ میری رائے پوچھ رہے ہیں تو جان رکھیے کہ میری ایشور یا رائے ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مزاح کو بھی داد دی اور سنجیدہ شاعروں کو بھی داد دی۔ دراصل معاشرہ سب کے اعتراف سے

بنتا ہے۔قومیں جن تین گروہوں سے بنتی ہیں اُن میں ایک ''اہلِ جمال'' کا گروہ ہے جو حضرت علامہ اقبال اور امجد اسلام امجد کی طرح ''مسجدِ قرطبہ'' کو تعمیر بھی کرتا ہے اور تحریر بھی کرتا ہے۔اس تمہید کا مقصد یہ تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ کچھ چیزیں آپ کے ساتھ بھی جائیں اور آپ کے دل میں اُتر جائیں۔میں کچھ چیزیں اپنی مرضی سے سنانا چاہتا ہوں۔سب سے پہلے بیٹیوں کے حوالے سے اک نظم سنانا چاہتا ہوں۔یہ نظم میں نے اپنی بیٹی ''روشنی'' کے لیے لکھی تھی جو ساری بیٹیوں کے لیے بن گئی۔

؎ نکی جئی اک دھی اے میری ، نکے تاریاں ورگی
ساریاں ورگی لگدی اے ، پر اوہنیں ساریاں ورگی

(اس پر بہت تالیاں بجیں لیکن زاہد فخری نے کہا، یہ کلیپ کم ہے۔بیٹیوں کے لیے ایک بھرپور کلیپ ہونی چاہیے۔)اس پر سارا ہال تالیوں سے گونج اُٹھا:

؎ ربا او دے لیکھاں اندر گوڑھیاں چھاواں رکھیں
ربا او دی صورت ویکھاں کدی نہ ہاریاں ورگی

☆☆☆☆

؎ جد دا میری دھی نے مینوں ابو کہنا سکھیا
اوسیں دن تو میں دکھی نے خوش خوش رہنا سکھیا
میں چپ ہوواں او چپ ہووے ، میں ہسّاں تے ہسّے
دھیے! کیویں بابل دا توں دکھ سکھ سہنا سکھیا

☆☆☆☆

؎ دور دراز دے سفراں اندر جد کدی وی جاواں
نکے نکے ہتھاں نالوں منگدی رہوے دُعاواں
میری ماں دے وانگوں او وی کنیاں فکراں والی
جگ وچ ایہو سانجے رشتے ، دھیاں ، بھیناں ماواں

(نظم ختم ہوئی تو سامعین فرطِ احساس وانبساط سے تالیاں بجاتے ہوئے اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے) زاہد فخری کہہ رہے ہیں کہ۔۔۔۔بیٹھ جایئے، میں آپ کو تازہ غزل سناتا ہوں۔نسبتاً تازہ غزل:

؎ دل میں غم سمونے میں دیر کتنی لگتی ہے
آنکھ کو بھگونے میں دیر کتنی لگتی ہے
زندگی کے ساحل پر وقت کے سونامی کو
بستیاں ڈبونے میں دیر کتنی لگتی ہے
عمر بیت جاتی ہے عزتیں بنانے میں
بے وقار ہونے میں دیر کتنی لگتی ہے
کاش حکمرانوں کی یہ سمجھ میں آ جائے
تاج و تخت کھونے میں دیر کتنی لگتی ہے

افضل خان! یہ شعر آپ کی نذر کرتا ہوں:

دھوپ میں ہوئی بارش اور میں نے یہ جانا
ہنستے ہنستے ، رونے میں دیر کتنی لگتی ہے
داغ ہو ندامت کا یا کوئی پشیمانی
آنسوؤں سے دھونے میں دیر کتنی لگتی ہے
مصلحت کی نیندوں پر فخریؔ لاکھ پہرے ہوں
پر ضمیر سونے میں دیر کتنی لگتی ہے

ایک غزل اور سناؤں گا۔میں آپ کی یونیورسٹی میں پہلی بار آیا ہوں۔بخاری صاحب اور عمران کی دعوت پر رحیم یار خان تو آتا رہتا ہوں۔یہ غزل بھی میرے ساتھ سفر کر رہی ہے۔یہ غزل میں نے یونیورسٹی کے زمانے میں اپنے محبوب کے لیے کہی تھی

لیکن میرا بیٹا ملازمت کے لیے جدہ جانے لگا تو مجھے یوں لگا جیسے میں نے یہ غزل اُس کے لیے لکھی ہے۔ آپ اس غزل کو کسی ناول کی طرح سنیے:

؎ اُسے اپنے فردا کی فکر تھی ، وہ جو میرا واقفِ حال تھا
وہ جو اُس کی صبحِ عروج تھی ، وہی میرا وقت زوال تھا
مرا درد کیسے وہ جانتا ، مری بات کیسے وہ مانتا؟
وہ تو خود فنا کے سفر پہ تھا ، اُسے روکنا بھی محال تھا
کہاں جاؤ گے مجھے چھوڑ کر ، میں یہ پوچھ پوچھ کے تھک گیا
وہ جواب مجھ کو نہ دے سکا ، وہ تو خود سراپا سوال تھا

(یہاں پر ناول کی طرح ایک اور موڑ آتا ہے۔)

؎ دمِ واپسیں اُسے کیا ہوا ، نہ وہ روشنی نہ وہ تازگی
وہ ستارہ کیسے بکھر گیا ، وہ تو آپ اپنی مثال تھا
وہ ملا تو صدیوں کے بعد بھی ، میرے لب پہ کوئی گلہ نہ تھا
اُسے میری ''چپ'' نے رُلا دیا جسے گفتگو میں کمال تھا
مرے ساتھ لگ کے وہ رو دیا ، مجھے فخریؔ اتنا وہ کہہ سکا
جسے جانتا تھا میں زندگی ، وہ تو صرف وہم و خیال تھا

میں نے پڑھ لیا ہے۔ میرے بعد بڑے بڑے شاعر ہیں۔ مزاح رہنے نہ دیں؟ اس پر مجمع ''مزاح مزاح'' پکارنے لگا تو زاہد فخری نے کہا کہ ایک مراثی نے اپنی بیوی نوں دوتن واری کہا کہ مینوں روٹی پکا دے، بڑی بکھ لگی اے۔ بیوی نے کہا ''میرے کول ٹائم نئیں۔'' مراثی کہیا ''ویکھ!، ویکھ میری بھین! توں مینوں روٹی پکا دے'' اے گل مولوی تک پہنچی تے انھاں نے کہیا ''سارے پنڈنوں روٹی کھواؤ'' مراثی قرضہ پھڑیا تے دیگاں پکا کے پروہنے بھوگے، شام نوں بیوی نوں کہن لگا

''بھاگوان! نکی جئی گل تے انی سزا ملی اے۔ تے ہن بہت قرضہ چڑھ گیا اے۔ بیوی بولی ''پہلے سوچ کے بولنا سی ناں۔'' مراثی کہن لگا ''فیر چھیڑن لگی ایں پیونوں۔''

؎ جوں جوں بدن کے اندر چولیں ہلتی جاتی ہیں
شوہر اور بیگم کی شکلیں ملتی جاتی ہیں
حیرت سے پھر اک دوجے کو تکتے رہتے ہیں
قینچی جیسی چرب زبانیں سلتی جاتی ہیں
بیگم لاکھ بلائے ، شوہر اونگھتا رہتا ہے
ہم سائی کے سامنے باچھیں کھلتی جاتی ہیں

شفیق الرحمٰن کہتے ہیں کہ عاشق ایک تل پر عاشق ہوتا اور سالم لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔ اسی زمین میں آپ نوجوانوں کے لیے:

؎ ففٹی کے جی بے بی تھی ، اب ون ففٹی بنتی جاتی ہے

یہ ہمارے زمانے کی محبوبائیں، آپ کے زمانے میں سلم اور سمارٹ ہیں ناں۔ وہ انجمن ہوتی تھی ہمارے زمانے میں۔ وہ اک فلم وچ ولن کہیندا اے منور ظریف نوں کہ انجمن نوں چک کے میرے ڈیرے تے پچاؤ۔ منور ظریف کہیندا ''چودھری جی! اوّل تے چکی نی جانی۔ جے چکی گئی تے فیر تہاڈے ڈیرے تے کیوں؟''

(اس پر زور زور سے تالیاں بجیں) زاہد فخری نے کہا ''بڑی ڈری ڈری تالیاں ہیں۔ اس پر تالیاں پھر بجیں۔''

؎ ففٹی کے جی بے بی تھی ، اب ون ففٹی بنتی جاتی ہے
ہاں محبوبہ بالکل اپنی ممی بنتی جاتی ہے
تِل پر لٹو ہونے والے رہ رہ کر پچھتاتے ہیں
چھیل چھبیلی بلّو ، باگڑ بلی بنتی جاتی ہے

؎ نرالی ہیں زمانے سے مرے محبوب کی باتیں
کہیں بھی وہ محبت کے سلیبس میں نہیں ملتیں
وہ کہتی ہے ''مری آنکھیں قلوپطرہ سے ملتی ہیں''
میں کہتا ہوں ''تری آنکھیں تو آپس میں نہیں ملتیں''

بس میرا خیال ہے کہ ایک آدھ بند ''پیکے'' سے سنا دوں۔ ویسے آپ کو پیکے سے کیا مسئلہ ہے؟ لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کا ایمان بھی تازہ نہیں ہوتا۔ لیکن پھر آپ کو اس کے بند بند پر تالیاں بجانا ہیں کہ میں یہ سنا سنا کر تھک گیا ہوں۔ نہ بیگم میکے جاتی ہے اور نہ آپ کا شوق کم ہوتا ہے۔ مشاعروں کے علاوہ یہ لاکھوں، کروڑوں موبائلوں پر چلی۔

؎ کدی تے پیکے جا ، نی بیگم
آوے سکھ دا سا ، نی بیگم

دل دار بھٹی مرحوم کہا کرتے تھے کہ محبت کا بخار شادی پہ اُترتا ہے۔ فیر بخار اُتر جاندا اے تے قرضہ چڑھ جاندا اے۔ چلیں جی، ہر بند کے بعد آپ کی بھرپور ''کلیپنگ'' آنی چاہیے:

کدی تے پیکے جا ، نی بیگم — آوے سکھ دا سا ، نی بیگم
کٹھیاں رہ رہ اَک گئے آں ہن — لاگے بہہ بہہ تھک گئے آں ہن
ٹینڈیاں وانگوں پک گئے آں ہن — تے بھر وی نکو نک گئے آں ہن
ہن سینے وِچ ٹھنڈ پا ، نی بیگم
کدی تے پیکے جا ، نی بیگم

تر و تازہ کر دیا آپ نے۔ ہر سال کہتا ہوں کہ اب نہیں سناؤں گا لیکن ہر سال شادیاں ہو جاتی ہیں:

کی کی رنگ وِکھا دِتے نیں — سجن یار چھڑا دتے نیں
پچھلے پیار بھلا دتے نیں — بینگن تک کھوا دتے نیں

ترس کوئی ہن کھا ، نی بیگم
کدی تے پیکے جا ، نی بیگم

☆☆☆☆

اِکو چھپڑ دے وِچ ترکے — کی لبھا اے شادی کر کے
جندڑی لنگھ چلی مر مر کے — اڈھے رہ گئے آں ڈر ڈر کے
مل گئی بڑی سزا ، نی بیگم
کدی تے پیکے جا ، نی بیگم

آخر میں ماں کے حوالے سے ایک مختصر سی نظم:

؎ جتھاں گھراں وِچ ماں نئیں ہوندی
انھاں دے ویہڑے چھاں نئیں ہوندی
پتر بھانویں ، جان وی منگن
ماواں کولوں ''ناں'' نئیں ہوندی
جے کر ماواں ''ہاں'' ناں کرن
رَبّ کولوں وی ''ہاں'' نئیں ہوندی

اسلم انصاری ۔۔۔۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد اسلم انصاری۔۔۔۔ شاعر، اُستاد، محقق، نقاد، فلسفی، مترجم، ناول نگار، معروف کا قائل، عامی کا حامی اور بہت سی زبانوں پر مکمل دسترس رکھنے والا ایسا ملتانی جس کے سامنے اہلِ زبان بھی پانی بھرتے نظر آئیں۔ ان کا ایک ایک لفظ، جملہ، مصرع، مضمون اور کتاب آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہے اور جنھوں نے اغیار کے مقابلے میں خود اپنے ساتھ بے انصافی کی اور بقول منیر نیازی ہر معاملے میں اپنے اوپر خود ظلم کیا۔۔۔۔ ۱۹۶۰ء میں ملتان سے فلسفے کی کلاس میں داخلہ لینے کے لیے گھر سے نکلے لیکن ایک خاص وجہ سے شعبۂ اُردو اورینٹل کالج پنجاب

یونیورسٹی لاہور میں داخلہ لے لیا جہاں اُس وقت عظیم طلبہ وطالبات، مستقبل کے اُستاد، محقق، نقاد، ادیب، اخبار نویس اور شاعر مثلاً خالدہ اصغر، سیّد قاسم محمود، عابد صدیق سوزؔ، رشید الزماں، عباس اطہر، فیضان دانش، عبدالشکور بیدل، ممتاز منگلوری اور خواجہ محمد زکریا زیرِ تعلیم تھے۔ اس سیشن کے پرائیویٹ طلباء میں انور محمود خالد نمایاں ترین تھے جب کہ سینئرز میں شیر مذاکرہ سیّد اسد اریب اور جونیئرز میں اے بی اشرف تھے۔ اسی سیشن کے فارسی زبان وادب کے طلبہ وطالبات میں سیّد آفتاب اصغر، انور مسعود اور صدیقہ انور شامل تھیں۔ اسی طرح شعبۂ عربی میں سیّد اسد اریب کے سیشن فیلو سیّد خورشید رضوی تھے۔ کہکشاں کے ان روشن ستاروں میں سے اکثر نامور شاعر ہوئے مثلاً صرف چار شعراء کی ایک ایک غزل ملاحظہ کیجیے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی غزل کے تیور دیکھیے:

ے زندہ ہیں جب تک ، مسلسل کام ہے
عاقبت آرام ہی آرام ہے
راستے دھندلا گئے ، دن ڈھل گیا
سامنے اِک جاودانی شام ہے
نامور ہونے کی قیمت کون دے؟
ہے وہی اچھا کہ جو گمنام ہے
نیکیوں کی بھی خدا توفیق دے
آپ کا کتنا مقدس نام ہے
آج ہر اندھے کا دعویٰ ہے یہی
مجھ پہ روشن باطنِ ایام ہے
یہ بلاوا ہے کرپشن کے لیے
خود ہی کوشش کر کے وہ بدنام ہے

جس کو جانچو ، کم نہیں شیطان سے
جس کو پرکھو ، فتنۂ ایام ہے
ہر کسی کی اپنی ہی تفسیر ہے
ہر کسی کا اپنا ہی اسلام ہے
کون سمجھے رہنماؤں کے بیاں
ان میں کچھ ابہام ، کچھ ایہام ہے

پروفیسر عابد صدیق کی غزل اور اس میں موجود معنویت پر غور کیجیے:

ے تانبا زمیں تھی ، آگ فلک ، ایک قہر تھا
در پیش آدمی کو قیامت کا پہر تھا
ملبوسِ خوف و جوع میں لپٹی ہیں بستیاں
اب دشتِ بے اماں ہے جو خوابوں کا شہر تھا
ظلمت بجاں تھے سرخ سویرے بھی دوستو
ہر عہد کو ملا ہے جو مقسومِ دہر تھا
سر پھوڑتی ہے سطوتِ رفتہ گلی گلی
پانی بلندیوں سے جو اُترا تو نہر تھا
سورج بلند ، یوں سرِ دیوارِ جاں ہوا
قرنوں کی حدتوں سے کڑا ایک پہر تھا
عفریت پانیوں کا اسے پھر نگل گیا
پیدا کثیف جھاگ بہت لہر لہر تھا
ہم تشنگی سے زیر ہیں ، ہر چند علم ہے
جس نے پیا ، اُسی کے پیالے میں زہر تھا

پروفیسر ڈاکٹر خورشید رضوی کی غزل نے اپنے عصر کو جس طرح سمیٹا ہے، اُس کی داد دیجیے:

؎ یہ جو ننگ تھے ، یہ جو نام تھے مجھے کھا گئے
یہ خیالِ پختہ جو خام تھے ، مجھے کھا گئے
کبھی اپنی آنکھ سے زندگی پہ نظر نہ کی
وہی زاویے کہ جو عام تھے ، مجھے کھا گئے
میں عمیق تھا جو پلا ہوا تھا سکوت میں
یہ جو لوگ محوِ کلام تھے ، مجھے کھا گئے
یہ عیاں جو آبِ حیات ہے ، اُسے کیا کروں؟
کہ یہاں جو زہر کے جام تھے ، مجھے کھا گئے
وہ نگیں جو خاتمِ زندگی سے پھسل گیا
تو وہی جو میرے غلام تھے ، مجھے کھا گئے
میں وہ شعلہ تھا جسے دام سے تو ضرر نہ تھا
یہ جو وسوسے تہہِ دام تھے ، مجھے کھا گئے
جو کھلی کھلی تھی عداوتیں ، مجھے راس تھیں
یہ جو زہر خند سلام تھے ، مجھے کھا گئے

ہر زمانے اور ہر دور کے عظیم شاعر انور مسعود کی ایک غزل کی آرائش دیکھیے:

؎ اب کہاں اور کسی چیز کی جا رکھی ہے
دل میں اک تیری تمنا جو بسا رکھی ہے
سربکف میں بھی ہوں ، شمشیر بکف ہے تو بھی
تو نے کس دن پہ یہ تقریب اُٹھا رکھی ہے

دل سلگتا ہے ترے سرد رویے سے مرا
دیکھ اس برف نے کیا آگ لگا رکھی ہے
آئینہ دیکھ ذرا ، کیا میں غلط کہتا ہوں
تو نے خود سے بھی کوئی بات چھپا رکھی ہے
جیسے تو حکم کرے ، دل مرا ویسے دھڑکے
یہ گھڑی تیرے اشاروں سے ملا رکھی ہے
مطمئن مجھ سے نہیں ہے جو رعیت میری
یہ مرا تاج رکھا ہے ، یہ قبا رکھی ہے
گوہرِ اشک سے خالی نہیں آنکھیں انورؔ
یہی پونجی تو زمانے سے بچا رکھی ہے

اس سیشن کے شعراء میں سے چار شاعروں کی ایک ایک غزل دیکھ چکے۔ یہ سب غزلیں اور ان غزلوں کے تقریباً سبھی اشعار ہر معیار پر پورے اُترتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ شعراء اپنے زمانۂ طالب علمی میں بھی شعر کہہ رہے تھے لیکن یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ ۶۲۔۱۹۶۰ء کے زمانے میں اسلامیہ کالج لاہور کے سالانہ مشاعروں میں ''شمع تاثیر'' کی ٹرافی تو صرف اسلم انصاری ہی جیتتے تھے۔ اس کے علاوہ ساظر ذاتی طور پر جن دو، تین درجن شعروں سے متاثر ہے، ان میں ایک شعر اسلم انصاری کا بھی ہے۔ شعر دیکھیے اور سر دھنیے کہ میں ایک عرصے سے اس شعر کو پڑھتا، سر دھنتا اور ہر ریڈنگ میں نئے معانی پاتا ہوں۔ آج بھی اس شعر نے مجھ پر نزول کیا اور اپنے نئے معنی منکشف کیے ہیں:

؎ نقش ایسا ہو کہ تصویر بنا دے سب کو
عکس ایسا ہو کہ بہتا ہوا دریا ٹھہرے

پروفیسر ڈاکٹر اسلم انصاری نے اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے مائیک سنبھالا اور فرمایا:

''جناب صدر ذی وقار حضرت تابش الوری صاحب، جناب امجد اسلام امجد صاحب، دیگر اساتذۂ کرام۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بہت سا خوب صورت کلام سننے سے محروم ہو جاؤں گا لیکن میری کچھ مجبوریاں ہیں۔ ذاتی بھی اور متعلقین کے حوالے سے بھی۔ اس لیے میں آج اس خوب صورت محفل سے رخصت چاہتا ہوں اور معذرت خواہ بھی ہوں۔ شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس یادگار مشاعرے میں مجھے شرکت کی دعوت دی۔ میرا بہاول پور سے تعلق بہت پرانا اور بہت گہرا ہے۔ یہ ایک غزل جس کا مصرع۔۔۔۔ایک شعر:

؎ اپنی صدا کی گونج ہی تجھ کو ڈرا نہ دے
اے دل! طلسمِ گنبدِ شب میں صدا نہ دے
دیوارِ خستگی ہوں ، مجھے ہاتھ مت لگا
میں گر پڑوں گا دیکھ ، مجھے آسرا نہ دے

یہ غزل میں نے بہاول پور ہی میں کہی تھی۔ دو رُباعیاں اور دو غزلیں پیش کروں گا آپ کی اجازت سے۔ عرض کیا ہے:

؎ تصویر میں ٹھہرا ہوا نغمہ تو نہیں
خوابوں کا سمن پوش دریچہ تو نہیں
سایہ تو نہیں ہے کسی ویرانے کا؟
دنیا کسی آواز کا دھوکہ تو نہیں

☆☆☆☆

ایک اور رُباعی ہے:

؎ خوابیدہ شراروں کے مقدر جاگے
تیشے کی صدا آئی تو پتھر جاگے
اِک یاد نے برپا کیا طوفانِ خیال
مہتاب جو اُبھرا تو سمندر جاگے

(اس سے آگے ریکارڈنگ نہ ہونے کے سبب اسلم انصاری کی شاعری تمام ہوئی اور اُن کی اعلان کردہ دو غزلیں ریکارڈ میں نہیں لیکن چونکہ ساظر کو مشاعرے اور اسلم انصاری کی تشریف آوری اور موجودگی کا ایک ایک لمحہ یاد ہے، لہٰذا اپنے حافظے کے باعث ان منظومات کو یاد کر سکتا ہے۔) سچ یہ ہے کہ دو رباعیاں نذرِ سامعین کر کے انصاری صاحب خود بھی بھول گئے کہ وہ کیا سنائیں؟ اور ذرا سا اُلجھ کر انھوں نے مذکورہ بالا غزل مکمل کی جس کے دو شعر پہلے ہی سنا چکے تھے اور جس کے بارے میں وہ فرما چکے تھے کہ یہ غزل بہاول پور میں کہی تھی۔ مکمل غزل اس طرح ہے:

؎ اپنی صدا کی گونج ہی تجھ کو ڈرا نہ دے
اے دل! طلسمِ گنبدِ شب میں صدا نہ دے
دیوارِ خستگی ہوں ، مجھے ہاتھ مت لگا
میں گر پڑوں گا ، دیکھ ، مجھے آسرا نہ دے
ہم سب اسیرِ دشتِ ہویدا ہیں دوستو
ہم میں کوئی کسی کو کسی کا پتا نہ دے
گل کر نہ دے چراغِ وفا ، ہجر کی ہوا
طولِ شبِ الم مجھے پتھر بنا نہ دے
تو سنگ دل سہی ، مگر اتنا ستم نہ کر
ثابت ہے میرا جرم ، پر ایسی سزا نہ دے

اک زندگی گزیدہ سے یہ دشمنی نہ کر
اے دوست! مجھ کو عمرِ ابد کی دُعا نہ دے
پیچھے ہٹوں تو پاؤں پکڑتی ہے یہ زمیں
اک لَو سی ہوں چراغ کی ، کوئی بجھا نہ دے

غزل تمام ہوئی تو سامعین بطورِ خاص نقیب مشاعرہ کی طرف سے ''مرے عزیزو، تمام دکھ ہے'' کی فرمائش ہوئی لیکن پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ انصاری صاحب اپنا کلام بھولنے لگے ہیں جس پر سٹیج پر متمکن کئی لوگ خاص طور پر ذیشان اطہر لقمے دینے لگے جس سے اسلم انصاری اور مذکورہ نظم کی مقبولیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے لیکن بہت اچھا ہوتا کہ انصاری صاحب نظم کے بارے میں وہ چند تمہیدی جملے نہ کہتے جن سے عامیوں کے علاوہ خواص کی نظر میں نظم کا وہ تاثر نہ رہا جس کی وجہ سے یہ نظم معروف ہے۔ بہرحال نظم ملاحظہ کیجیے:

میرے عزیزو،
مجھے محبت سے تکنے والو،
مجھے عقیدت سے سننے والو،
مرے شکستہ حروف سے اپنے من کی دنیا بسانے والو،
مرے الم آفریں تکلم سے انبساطِ تمام کی لازوال شمعیں جلانے والو،
بدن کو تحلیل کرنے والی ریاضتوں پر عبور پائے ہوئے، سکھوں کو تجے ہوئے
بے مثال لوگو،
حیات کی رمزِ آفریں کو سمجھنے والو، ۔۔۔۔عزیز بچو۔۔۔۔میں بجھ رہا ہوں
مرے عزیزو، میں جل چکا ہوں، ۔۔۔۔
مرے شعورِ حیات کا شعلۂ جہاں تاب بجھنے والا ہے

میرے کرموں کی آخری موج میری سانسوں میں گھل چکی ہے
میں اپنے ہونے کی آخری حد پہ آ گیا ہوں
۔۔۔۔تو سن رہے ہو، مرے عزیزو، میں جا رہا ہوں
میں اپنے ہونے کا داغ آخر کو دھو چلا ہوں
میں جتنا رونا تھا، رو چلا ہوں

مجھے نہ اب انت کی خبر ہے، نہ اب کسی چیز پر نظر ہے
میں اب تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ نیستی کے، سکوتِ کامل کے،
جہلِ مطلق۔۔۔۔(کہ علم مطلق ہے)۔۔۔۔جہل مطلق کے
بحرِ بے موج سے ملوں گا تو انت ہوگا
اس التباسِ حیات کا، جو تمام دکھ ہے!
میں دکھ اُٹھا کر۔۔۔۔مرے عزیزو۔۔۔۔میں دکھ اُٹھا کر
حیات کی رمزِ آخریں کو سمجھ گیا ہوں، تمام دکھ ہے
وجود دکھ ہے، وجود کی یہ نمود دکھ ہے
حیات دکھ ہے، ممات دکھ ہے
یہ ساری موہوم و بے نشاں کائنات دکھ ہے
شعور کیا ہے، اک التزام وجود دکھ ہے اور وجود کا التزام دکھ ہے
جدائی تو خیر آپ دکھ ہے، ملاپ دکھ ہے
کہ ملنے والے جدائی کی رات میں ملے ہیں، یہ رات دکھ ہے
یہ زندہ رہنے کا، باقی رہنے کا شوق، یہ اہتمام دکھ ہے
سکوت دکھ ہے، کہ اس کے کربِ عظیم کو کون سہہ سکا ہے

کلام دکھ ہے، کہ کون دنیا میں کہہ سکا ہے جو ماورائے کلام دکھ ہے
یہ ہونا، دکھ ہے، نہ ہونا دکھ ہے، ثبات دکھ ہے، دوام دکھ ہے
مرے عزیزو، تمام دکھ ہے

نظم اچانک ختم نہیں ہوئی بلکہ اسلم انصاری نے نظم کو ٹھہر ٹھہر، رک رک اور دہرا دہرا کر مکمل کیا۔ نظم کے دورانیے میں سارا منظر خاموش ہو گیا تھا یا کم از کم ساظر کو ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔ تب اسلم انصاری نے اپنے زمانۂ طالب علمی کی ایک غزل شروع کر دی جو ریڈیو سے بھی اکثر اوقات نشر ہوتی رہتی ہے۔

میں نے روکا بھی نہیں اور وہ ٹھہرا بھی نہیں
حادثہ کیا تھا ، جسے دل نے بھلایا بھی نہیں
جانے والوں کو کہاں روک سکا ہے کوئی
تم چلے ہو ، تو کوئی روکنے والا بھی نہیں
دور و نزدیک سے اُٹھتا نہیں شورِ زنجیر
اور صحرا میں کوئی نقشِ کفِ پا بھی نہیں
گل بہ ہر رنگ ، تبسم کا گنہ گار رہا
زخم ہستی کا سوا اس کے مداوا بھی نہیں
کون سا موڑ ہے ، کیوں پاؤں پکڑتی ہے زمیں
اُس کی بستی بھی نہیں ، کوئی پکارا بھی نہیں
بے نیازی سے سبھی قریۂ جاں سے گزرے
دیکھتا کوئی نہیں ہے کہ تماشا بھی نہیں
وہ تو صدیوں کا سفر کر کے یہاں پہنچا تھا
تو نے منہ پھیر کے جس شخص کو دیکھا بھی نہیں

اب تو اک رات ہے ہجراں کی ، دل و جاں پہ محیط
صبح کیسی ، کہ ترے بعد اُجالا بھی نہیں
اک مسافر کہ جسے تیری طلب ہے کب سے؟
احتراماً ترے کوچے سے گزرتا بھی نہیں
کس کو نیرنگیٔ ایام کی صورت دکھلائیں
رنگ اُڑتا بھی نہیں ، نقش ٹھہرتا بھی نہیں
یا ہمیں کو نہ ملا اُس کی حقیقت کا سراغ
یا سرا پردۂ عالم میں کوئی تھا ہی نہیں

اسلم انصاری نے اس غزل کے تمام شعر نہیں پڑھے تھے لیکن ساظر اپنا قلم روکنے سے قاصر رہا اور اب دُعا گو ہے کہ اللہ کرے پروفیسر ڈاکٹر اسلم انصاری کو عمرِ خضر اور کوئی اچھا محقق اور نقاد میسر ہو۔)

ممتاز اطہر کو دعوت دی گئی تو انھوں نے مائیک سنبھالتے ہی ایک نثری نظم شروع کر دی یعنی ایسی گفتگو جو نثر ہونے کے باوجود شعر کی طرح پُر لطف تھی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ریکارڈنگ کی خرابی کے باعث ساظر کو کہیں ممتاز اطہر کا نام سنائی نہ دیا تو ساظر نے ایک ڈھلتی شام میں ٹیلی فون پر درخواست کی تو ممتاز اطہر نے فرمایا کہ اگر مجھے غزلوں کے مطلع مل جائیں تو میں مشاعرے میں پیش کردہ غزلیں لکھ بھیجوں گا لیکن چونکہ ذرا سی محنت سے اُن کی درج ذیل گفتگو بھی مل ہو گئی اور غزلوں میں شامل تخلص سے کلام کا اندازہ ہو گیا تو دوبارہ رابطے کی ضرورت نہیں رہی البتہ مشاعرے میں اُن کی گفتگو سے دو تین باتوں کا اندازہ ہوا۔ اوّل یہ کہ وہ اُن شعراء سے زِچ ہوئے جنھوں نے گھڑی کے مطابق پون پون اور ایک ایک گھنٹہ پڑھا۔ ممتاز اطہر نے یہ بھی بتا دیا کہ مشاعرے میں شعراء کی ترتیب کیا ہونا چاہیے البتہ اُن کے خیال میں اسلم انصاری برصغیر

کے معروف شاعر ہیں حالانکہ اسلم انصاری کو زمانۂ حال کا سب سے بڑا اُردو شاعر کہنا چاہیے۔ بہرحال ممتاز اطہر کی لفظ بہ لفظ گفتگو اور شاعری ملاحظہ کیجیے:

''وقت بہت ہو گیا ہے،۔۔۔۔ایک ایک گھنٹہ، پون پون گھنٹہ شاعر پڑھتے رہے ہیں۔ہمیں اسلم انصاری صاحب سے بالکل آخر میں سننا تھا کہ ہمارے شہر ہی کے نہیں بلکہ برصغیر پاک و ہند کے معروف شاعر ہیں۔ مجھے اُن کے بعد پڑھنا عجیب لگ رہا ہے لیکن چند شعر دیکھیے:

؎ عشق میں جان کو آزار سے لگ جاتے ہیں
دل کی ہر سمت میں انگار سے لگ جاتے ہیں
دن کو ہم کارِ زمانہ میں لگے رہتے ہیں
شام ہوتے ہی درِ یار سے لگ جاتے ہیں
سلسلہ وار ترے خواب مری آنکھوں میں
ٹوٹتے ٹوٹتے انبار سے لگ جاتے ہیں
ایسے زخموں کی کسک دیر تلک رہتی ہے
جو کسی پھول کی گفتار سے لگ جاتے ہیں
ہم کوئی یوسفِ ثانی تو نہیں ہیں پھر بھی
جا بہ جا شہر میں بازار سے لگ جاتے ہیں
خشک پتے ہیں ، بھلا راہ میں حائل کب ہیں؟
آپ کہتے ہیں تو دیوار سے لگ جاتے ہیں
ہم تو خاشاک ہیں ، ٹھوکر نہ لگائیں صاحب
اُڑنے لگ جائیں تو دستار سے لگ جاتے ہیں
سنتے ہیں حاشیہ برداری ہنر ہے اطہؔر
جن کو آتا ہے وہ دربار سے لگ جاتے ہیں''

اہلِ بہاول پور ایسی صاف ستھری اور تغزل کی تمام خصوصیات کی حامل غزل شاید بہت عرصے کے بعد سن رہے تھے جس نے زبانوں پر تالے لگانے کے علاوہ دست و باز و کو بھی بے حس و حرکت کر دیا تھا لیکن غزل مکمل ہوئی تو بہت سے ہونٹ ہلے اور داد دینے لگے۔ تبھی ممتاز اطہر نے دوسری غزل شروع کر دی:

؎ ضبط نے درد کا دَر باز نہیں ہونے دیا
دل کی آواز کو آواز نہیں ہونے دیا
جانے کس بات کی تفہیم کا دھڑکا تھا اُسے
اُس نے اظہار کا آغاز نہیں ہونے دیا
اک فسوں اور بھی آنکھوں میں اُتارا ہوا ہے
اس لیے خواب کو ہم راز نہیں ہونے دیا
آسماں خاک نشینوں کو صدا دیتا رہا
خاک نے مائلِ پرواز نہیں ہونے دیا
دشت ہو ، شہر ہو ، جاری ہے مرا رقص جنوں
میں نے خود کو نظر انداز نہیں ہونے دیا
ایک ایک حرف کو سینے میں چھپائے ہوئے ہوں
قصۂ ہجر کو ممتاز نہیں ہونے دیا

گو یہاں تخلص بدل گیا لیکن غزل کے تیور وہی ہیں اور سامعین کی دلچسپی کی کیفیت بھی وہی ہے۔ ایسے میں زیادہ پڑھنے اور سنانے والوں کا گلہ کرنے والے ممتاز اطہر نے تیسری غزل شروع کر دی جو پہلی دو غزلوں سے بھی اچھی اور بہتر نشتروں جیسی کاٹ رکھنے والی غزل تھی۔ ملاحظہ کیجیے:

؎ اس لیے بھی ترے در پر کم ہیں
ہم ابھی خود کو میسر کم ہیں

کیا ہوا تیرا جمالِ پیکر
آئینے حیراں و ششدر کم ہیں
اپنے رنگوں کی دھنک بھرنے دے
میرے اطراف میں منظر کم ہیں
تو نے گل رنگ ہمیں کرنا تھا
پر ترے ہاتھ میں پتھر کم ہیں
ہم پہ صحرا بھی یقیں کیوں کرتا
ہم جو وحشت میں اُجاگر کم ہیں
کیا ہوئے دشتِ بلا کے لشکر
جو سمجھتے تھے ، بہتر کم ہیں
آگ لے جائیں مرے سینے سے
وہ ستارے جو منور کم ہیں
ہاں کوئی زعم نہیں ہے ہم کو
ہم زیادہ بھی سراسر کم ہیں
موجِ غم سر سے ہے اونچی اطہر
اور ہم ہیں کہ شناور کم ہیں

ذیشان اطہر نے عزیز شاہد کو بلانا چاہا تو فرمایا کہ عزیز شاہد ڈیرہ غازی خان سے تشریف لائے ہیں جو سرائیکی کے مہان شاعر ہیں لیکن ساظر کے نزدیک یہ تعارف بھی مختصر اور نامکمل تھا کہ عزیز شاہد سب سے پہلے بہت اچھے انسان اور پختہ نظریات کے حامل انسان ہیں۔ان کا پہلا مجموعۂ کلام ''پنیال'' کے نام سے مئی ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا تھا۔اس کے بعد جنوری ۲۰۱۹ء میں ''درشن'' کے نام سے ان کا کلیات نما کلام شائع

ہوا۔ بہت اچھی شاعری کے علاوہ مجھے اس کے چھ حصوں میں تین نام رانا محبوب اختر، ڈاکٹر شکیل پتافی اور ڈاکٹر جاوید چانڈیو پا اور دیکھ کر مجموعے سے ایک خاص طرح کی اُنسیت بھی محسوس ہوئی۔عزیز شاہد نے ''درشن'' میں بہت سی شخصیات کو موضوع بنانے کے علاوہ نئی صنفیں بھی اختیار کی ہیں۔مثلاً ہائیکو کے وزن پر ''سرائیکو'' وغیرہ۔''درشن'' کا مطالعہ و محاکمہ موضوعات، فن اور اصناف و ہیئتوں کے حوالے سے بھی ہونا چاہیے۔ بہر حال عزیز شاہد نے پہلا ہی مصرع پڑھا تو بوجوہ سارا ہال اور مشاعرہ گاہ ''آہ اور واہ'' کی آوازوں سے گونج اُٹھا حالانکہ شوریلے شاعر اپنی اپنی راہ لے چکے تھے۔ بہر حال عزیز شاہد کا کلام دیکھیے جسے پیش کرتے ہوئے عزیز شاہد نئے انداز سے سلیوٹ کا طریقہ اختیار کرتے اور داد پر شکریہ ادا کر رہے تھے:

ے ہتھ وچ پرایا پاند ہا ، آخر ہتھوں چُھٹناں تا ہا
ہیناں وی ہَم ، ضِدی وی ہَم ، دھاگا کیتھنوں ترٹناں تا ہا
ہک نال ڈو دا بول ہا ، میں خواب دا تے لا ڈتن
تیڈا شہر ہا جانیاں ، آخر کہیں لُٹناں تا ہا

☆☆☆☆

ے تیئں نین ڈتے ،تیئں خواب ڈتے ،تیئں نازیں نال الھورل ڈتے
کجھ رول اساں وی ہا سے پئے ، کجھ سانول تیئں وی رول ڈتے

☆☆☆☆

ے ساکوں بیا کون مار سگدا ہا ، ساڈیاں قاتل تاں ہن تیڈیاں اکھیں
اساں ہر وار مر کے وَل جیسوں ، اپنیاں اکھیں سنبھال کے رکھیں

☆☆☆☆

مستقل ہجر کوئی قیامت ہئی اے تسلسل شراب تھی ویندے

جانیا! تو میکوں نہ ملیا کر مل کے وِچھڑن عذاب تھی ویندے

☆☆☆☆

خواب آندے میکوں سما ڈیندے اندر اندر وَلاَ جگا ڈیندے
ہُنڑ وی کوئی گال چا کرے اُوندی گالھا دل اے ، دھمال پا ڈیندے

غزل کے کچھ اشعار:

؎ غیر ہتھ اچ مہار ڈیواں کیا!
کونج کلہی قطار ڈیواں کیا!
عقل دی من کے ، منکراں دشمن
آپ کوں آپ مار ڈیواں کیا!
او جو رُس گئے تاں رُس ونجاں میں وی
در دی جا تے دیوار ڈیواں کیا!
سر تاں صدقہ ہے ہک تیڈی سک دا
تیڈے پیریں توں وار ڈیواں کیا!
میڈی قسمت ہے کیا میڈی قسمت
تیڈیاں زُلفاں سنوار ڈیواں کیا!
جِن تے جُل ، میں تاں نال ہاں تیڈے
وقت کوں وی وِنگار ڈیواں کیا!
بھُل ونجاں؟ کیویں بھُل ونجاں تیکوں
آپ کوں وی وِسار ڈیواں کیا!
کیوں بھلا ڈیواں شور جنگل دا
کنڈ تے کنڈیاں دا بار ڈیواں کیا!

مونجھ وسوں ہے من دے ویڑھے دی
بے زباں کوں بزار ڈیواں کیا!
توں جنم توں ، میڈی جنم بھومی
جان کلہیں گزار ڈیواں کیا!

(عزیز شاہد نے اپنی جگہ چھوڑی لیکن ہر طرف سے ایک نظم کی فرمائش ہونے لگی۔ فرمائش بڑھی تو عزیز شاہد کو دوبارہ شاعر کے لیے مخصوص سیٹ پر آنا اور نظم سنانا پڑی):

رستے دے وِچ کجھ موڑ ائے

کوئی تار ہئی ، کہیں تار تے کجھ دھیان وِچ دربار ائے
آئیاں گلیاں رنگیں بھریاں کئی شہر ، کئی بازار ائے
سِر تے پھُلیں دیاں ٹوکریاں پیریں تلے کجھ خار ائے
کجھ تھل دے رستے ریتلے کجھ کجھ سمندر تار ائے
ہر سیڑھ تے ہک دل ہا جو دیدیں تے در توں پار ائے
ہر وار اوہو دل میڈا ترٹ کے وَلا اُروار ائے
اے تاں ایویں پھس پئے سروں گل تیئں پھُلاں دے ہار ائے
میں نئیں پچھیا ، میں کیوں پچھاں کیا بوڑھ ائے ، کیا تار ائے
کھیسہ پھلورن کُوڑ ہا کیا جیت ائے ، کیا ہار ائے
کوئی علم نئیں جو آپ کوں کیں کیں دے قدمیں وار ائے
کیں کیں کوں راہ وِچ رول ائے کیں کیں کوں منڑ تے مار ائے
پیریں توں لاتے سر توئیں ہر وار تھی سنگ سار ائے
پر اپنڑی موج اِچ پار کوں ڈو چار ہکلاں مار ائے
دل دی ادا تے کئی دفعہ کجھ ترس ائے ، کجھ پیار ائے

وت دگ ملے ، وت ٹُر پیاں   وت قول وِچ اقرار ائے
میں نئیں تھکیا ، میں کیوں تھکاں   چھالیں دے سر تے بار ائے
میں نئیں رُکیا ، روکݨ تو ئے   کئی یار ، کج اغیار ائے
میں مست ہم ، میں کیا خبر   کیا غیر ائے ، کیا یار ائے
بے سود ائے ، بے سوز ائے   بے وقت ائے ، بے کار ائے
ٹُر دا رہیاں بھُر دا رہیاں   چرچے تو ئے چو دھار ائے
پر رک گیاں جتھ وی تیڈے   پیریں دا کوئی کھسکار ائے
پازیب یاد آگئی تیڈی   ساہواں وِچوں جھنکار ائے
وت مُسک یاد آگئی تیڈی   وت یاد منہ مُسکار ائے
پل پل دیاں پینگھاں پا کرائیں   لب لسکدے لسکار ائے
گلھیں دے چگھ یاد آگئے   وَت یاد رُخ ، رُخسار ائے
لب یاد ائے ، رَبّ یاد ائے   وَت چِلکدے ، چِلکار ائے
اکھیں تیڈیاں ، ماکھی لگین   ساکوں کڈاں انکار ائے
وت جھوک یاد آگئی تیڈی   وت یاد کئی گھر بار ائے
کنیں دے وِچ کئو جاگ پئی   گُھب گُھب مٹی گھبکار ائے
لخطے دیاں لسیاں پی کرائیں   دل اپݨا تن من ٹھار ائے
بے شور دل ، نت رول دل   ہر شے کوں راہ وِچ چھوڑ ائے
کشکول تاں پُرباش ہا   پھُل تاں منڈھوں ، ڈو چار ائے
رستے دے وِچ کجھ موڑ ائے

ہر ہر مصرع اور ہر ہر شعر پر مجمع بے قابو ہوا جاتا تھا اور عزیز شاہد بھی ہر مصرع، ہر شعر اور ہر ہر بند بڑی توجہ اور دہرا دہرا کر سنا رہے تھے۔

باقی احمد پوری کا نام مقبول حسین ہے اور ان کا تعلق تحصیل صادق آباد ضلع رحیم یار خان کے قصبے ''احمد پور لمہ'' سے ہے۔ باقی احمد پوری کا شمار بہاول پور بلکہ اُردو کے سینئر شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کی تقریباً ڈیڑھ درجن شعری کتب چھپ چکی ہیں جن میں کچھ ''انتخاب'' بھی شامل ہیں۔ باقی احمد پوری ایک عرصے سے لاہور میں مقیم ہیں۔

؎ روز وحشت ہے مرے شہر میں ویرانی کی
اب کوئی بات نہیں ، بات پریشانی کی
میرے دریا کبھی دریا بھی ہوا کرتے تھے
اب بھی آواز سی آتی ہے مجھے پانی کی
آئنہ خانے کے باہر وہ مجھے پوچھتے ہیں
آئنہ خانے میں کیا بات تھی حیرانی کی
اب غزالاں سے کہو چھپ کے کہیں بیٹھ رہیں
آمد آمد ہے کسی غولِ بیابانی کی
ہم کھلے گھر کے مکینوں کی یہی عادت ہے
ہم نہ دربان ہوئے اور نہ دربانی کی
یاد کر لینا بہتّر کی کہانی باقیؔ
جنگ چھڑ جائے کسی وقت اگر پانی کی

☆☆☆☆

؎ اُداس بام ہے ، در کاٹنے کو آتا ہے
ترے بغیر یہ گھر کاٹنے کو آتا ہے
خیالِ موسمِ گل بھی نہیں ستمگر کو
بہار میں بھی شجر کاٹنے کو آتا ہے

فقیہہِ شہر سے انصاف کون مانگے گا
فقیہہِ شہر تو سر کاٹنے کو آتا ہے
اسی لیے تو کسانوں نے کھیت چھوڑ دیئے
کہ کوئی اور ثمر کاٹنے کو آتا ہے
ترے خیال کا آہو کہیں بھی دن میں رہے
مگر وہ رات ادھر کاٹنے کو آتا ہے
کہا تو تھا کہ ہمیں اس قدر بھی ڈھیل نہ دے
اب اُڑ رہے ہیں تو پَر کاٹنے کو آتا ہے
یہ کام کرتے تھے پہلے سگانِ آوارہ
بشر کو آج بشر کاٹنے کو آتا ہے
یہ اُس کی راہ نہیں ہے مگر یونہی باقیؔ
وہ میرے ساتھ سفر کاٹنے کو آتا ہے

☆☆☆☆

بہت جلدی تھی گھر جانے کی لیکن
مجھے پھر شام رستے میں میں پڑی ہے
نصابِ زندگی جس میں لکھا ہے
کتابِ دل وہ بستے میں پڑی ہے
نہیں ارزاں متاعِ رائیگانی
مگر مجھ کو یہ سستے میں پڑی ہے
وہ ایسے ڈھونڈنے نکلے ہیں باقیؔ
محبت جیسے رستے میں پڑی ہے

اظہر ادیب کا اصل نام نیاز احمد ہے اور ان کا شمار بہاول پور کے نمایاں شعراء میں ہوتا ہے۔ان پر شعبۂ اُردو واقبالیات میں ایم۔اے اور ایم۔فل کے مقالات لکھے جا چکے ہیں۔اظہر ادیب کے نمایاں تخلیقی کاموں میں ''منڈیروں پر دیے رکھنا''، ''ہے کوئی کوزہ گر''، ''آنکھیں، صحرا، دھوپ''، ''صدا بانٹتی تو ہے'' اور ''بھیگی رات کی دھن'' وغیرہ شعری مجموعے شامل ہیں جب کہ اظہر ادیب کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب اور کس طرح کا تخلیقی کام کر ڈالیں۔وہ ماحول شناس شخص ہیں۔انھیں اندازہ ہوا کہ عزیز شاہد کی مقبول رومانی سرائیکی شاعری کے سامنے کسی کا چراغ جلنا مشکل ہے۔لہٰذا انھوں نے وقت کی تنگی اور رات کے بھیگ جانے کا ذکر کر کے صرف چار شعر سنائے۔انھوں نے فرمایا:

ے وہ شب کے سائے میں فصلِ نشاط کاٹتے ہیں
ہم اپنی ذات کے حجرے میں رات کاٹتے ہیں
یہ لمحہ اہلِ محبت پہ سخت بھاری ہے
یہ لمحہ اہلِ محبت کے ساتھ کاٹتے ہیں
عجیب لوگ ہیں اس عہدِ بے مروّت کے
زبان کاٹ نہ پائیں تو بات کاٹتے ہیں
یہ رنگ لے کے کہاں آگئے ہو تم اظہرؔ
یہاں تو لوگ مصور کے ہاتھ کاٹتے ہیں

اظہر ادیب یہ اشعار سنا کر جانے لگے تو سامعین و حاضرین نے انھیں روکا۔ بالخصوص امجد اسلام امجد نے کچھ اور سنانے کو کہا تو اظہر ادیب دوبارہ بیٹھ گئے اور ایک غزل کے چند اشعار سنائے:

ے کل پردیس میں یاد آئے گی دھیان میں رکھ
اپنے شہر کی مٹی بھی سامان میں رکھ

پورے جسم کو لے کر گھوم زمانے میں
بس اِک دل کی دھڑکن پاکستان میں رکھ
تتلی رستہ بھول کے آ بھی سکتی ہے
کاغذ کے یہ پھول ابھی گُل دان میں رکھ
کرنیں جانے کس رستے سے آجائیں
دل دہلیز پہ آنکھیں روشن دان میں رکھ
اپنے دل سے رُسوائی کا خوف نکال
اظہرؔ اب تصویر مری دالان میں رکھ

میرے نزدیک خورشید ناظر اس لیے چھائے رہے کہ وہ جہاں تشریف فرما تھے، اتفاق سے اُن کے سامنے پڑھنے والے شاعر کی نشست رکھی گئی تھی۔ یوں ہر شاعر کے کلام کے دوران میں خورشید ناظر بھی نمایاں رہے اور کیوں نہ ہوتے کہ کلام اور اشعار کی تعداد یا معیار دونوں اعتبار سے خورشید ناظر نمایاں تر ہیں۔ مثلاً دو غیر مطبوعہ ہائے غزل و نظم کے علاوہ ان کے کھاتے میں ''بلغ العلیٰ بکمالہٖ''، ''منظوم شرح اسماء الحسنیٰ''، ''وللّٰہ الحمد''، ''توشیح اسمائے محمدؐ'' اور ''ملاک و محورِ عالم محمدؐ'' شامل ہیں جب کہ صرف اوّل الذکر ہی میں تقریباً سترہ ہزار شعر موجود ہیں۔ ''ہر قدم روشنی'' خورشید ناظر کے سفر نامۂ حج کا عنوان ہے جس کے دو ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ پہلے ایڈیشن میں صرف اوّلین حج کا احوال ہے جب کہ دوسرے ایڈیشن میں بعد ازاں کیے جانے والے عمرہ جات کے دل نشیں حالات بھی قلم بند کیے گئے ہیں۔ ''ہر قدم روشنی'' ہی پر خورشید ناظر کو ''شانِ بہاول پور'' کا ایوارڈ مل چکا ہے۔ اُردو تنقید کے حوالے سے خورشید ناظر کی دو تصانیف ''کلامِ فرید اور مغرب کے تنقیدی رویے'' اور ''خواجہ فرید کی کافیوں میں قوافی کا فنی جائزہ'' شائع ہوئی ہیں۔ خورشید ناظر کا شمار بہاول پور کے اُن اہلِ قلم میں ہوتا

ہے جو بہت لکھتے اور بہت سنبھل کر لکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کی جملہ سازی اور جملہ بازی بھی قابلِ توجہ ہوتی ہے۔ سارے مشاعرے میں انھوں نے دو جملے بولے لیکن دونوں بہت کمال کے تھے۔ مثلاً مائیک سنبھالتے ہی فرمایا ''شور والے چلے گئے ہیں اور شعور والے بیٹھے ہیں'' پھر دوسری غزل سنانے سے پہلے فرمایا ''میں نے دو سو غزلیں سنی ہیں تو کیا میں دو غزلیں بھی نہ سناؤں؟'' بہر حال اُن کی دونوں غزلوں کے اشعار سنیے جو انھوں نے بہت توجہ سے عطا کیے:

ے پرندوں کو شجر کھانے لگے ہیں
عجب منظر نظر آنے لگے ہیں
گھٹائیں اس طرح روٹھی ہیں ہم سے
کنول خوشیوں کے مرجھانے لگے ہیں
نہیں اب ربط کوئی منزلوں سے
سفر سے لوگ اُکتانے لگے ہیں
تمہاری بے وفائی کے سبب ہم
تمہارے شہر سے جانے لگے ہیں
عجب انداز میں بدلیں ہوائیں
شجر آپس میں ٹکرانے لگے ہیں
بچھی ہے خامشی شہروں میں ناظرؔ
ہمیں تو شہر ویرانے لگے ہیں

☆☆☆☆

ے مرے بیٹوں نے کل گھر بیچ ڈالا
فقط گھر کیا ، مرا سر بیچ ڈالا

فقیہہِ شہر نے جاگیر لے کر
کلہ کے ساتھ منبر بیچ ڈالا
گھٹاؤں سے ہوائیں لڑ پڑی ہیں
ہواؤں نے سمندر بیچ ڈالا
بتوں کو بھی نہیں راس آئی عزت
انھوں نے آج مندر بیچ ڈالا
جسے کہتے تھے وہ ماتھے کا جھومر
انھوں نے خود وہ جھومر بیچ ڈالا
عجب خورشید ہے ، کل اُس نے ناظرؔ
زمیں اور اس کا محور بیچ ڈالا

پروفیسر ڈاکٹر ذیشان اطہر فرمانے لگے کہ خورشید احمد ناظر نے حسبِ وعدہ دو غزلیں پیش کی ہیں۔ میں اُن کے کلام پر بھی داد دیتا ہوں اور اُن کے اس کام پر بھی۔ اس کے بعد ہمارے شاعر..... کیونکہ اُس کے بعد مہمانِ خصوصی اور صدر ہوں گے۔ جناب پروفیسر ڈاکٹر قاسم جلال..... چہار زبان شاعر.....تنقید، تحقیق، نظم ونثر ان کے میدان ہیں۔ ان کے شعری مجموعوں میں ''اقدار''، ''زہر وتریاق'' اور ''رموزِ عرفان'' جیسے خوب صورت مجموعے ہیں۔

ہم تشخص کھو رہے ہیں ذات کی تشہیر میں
خود بکھرتے جا رہے ہیں کوششِ تعمیر میں
اے سخن ور! تم جو کہتے ہو ، وہ کرتے کیوں نہیں
کیوں ہم آہنگی نہیں کردار اور تحریر میں

تشریف لاتے ہیں جناب پروفیسر ڈاکٹر قاسم جلال.....ڈاکٹر صاحب تشریف

لائے اور فرمایا.....معزز سامعین گرامی! غزل کے چند اشعار سماعت فرمائیں:

چہرہ بدلیں ، نہ آئینہ بدلیں
اب نگاہوں کے زاویے بدلیں
پھر ملاقات ہو نہ جائے کہیں
راستے احتیاط سے بدلیں
سامنے ہوں اگر نئے منظر
ہم بھی آنکھوں کے ذائقے بدلیں
سوچ ہے اب ہر انقلابی کی
میں رہوں یونہی ، دوسرے بدلیں
روز تصویر اک بدلنے سے
ہے یہ بہتر کہ چوکھٹے بدلیں
ہر طرف اک جمود طاری ہے
آؤ انداز سوچ کے بدلیں
یہ مسیحائی مار ڈالے گی
اب خدارا یہ مشورے بدلیں
آج کل معتبر وہی ہیں جلالؔ
بھیس ہر روز جو نئے بدلیں

ایک اور غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

تھا خوف بجھنے کا ، لیکن دیا جلانا تھا
ہوا کا ظرف ابھی اور آزمانا تھا
یہ کیا کہ غیر نے کی تجھ پہ آ کے سنگ زنی
خود اپنے ہاتھ سے اپنا لہو بہانا تھا

ابھی سے تیز ہواؤں میں اُڑ گئے تنکے
ابھی تو ہم کو نیا آشیاں بنانا تھا
ہزار شکر کہ چہروں سے اُٹھ گئے ہیں نقاب
عقیدتوں نے نیا گل کوئی کھلانا تھا
سماعتوں پہ لگے قفل توڑتے پہلے
فسانۂ دلِ بے تاب گر سنانا تھا
ملے ہیں یوں کہ کبھی جس طرح ملے ہی نہ تھے
وہ لوگ جن سے تعلق بہت پرانا تھا
وفا کو پاؤں کی زنجیر کیوں بنایا تھا
جو تجھ کو بھول گیا ، اُس کو بھول جانا تھا
جلالؔ تلخ حقیقت نے کھول دی آنکھیں
اگرچہ خواب کا منظر بڑا سہانا تھا

اس کے بعد امجد اسلام امجد یعنی مشاعرے کے دوسرے مہمانِ خصوصی کو دعوت دی گئی۔ یاد رہے کہ ادبی وثقافتی فیسٹیول کے دونوں مہمانانِ گرامی یعنی پروفیسر ڈاکٹر اسلم انصاری اور پروفیسر امجد اسلام امجد میں شاعر وادیب اور فلسفیانہ سوچ کے حامل ہونے کے علاوہ بھی دو تین قدر ہائے مشترک ہیں۔ اوّل یہ کہ دونوں شعبۂ اُردو، اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور کے طالب علم رہے ہیں۔ دونوں مختلف زمانوں میں آرٹس کونسلوں کے سربراہ رہے ہیں اور دونوں نے آج کے مشاعرے میں اپنے اپنے عہدِ رفتہ یعنی اورینٹل کالج کے زمانۂ طالب علمی میں کہی ہوئی نظمیں اور غزلیں عطا کی ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ امجد اسلام امجد اُس سیشن کے طالب علم تھے جس میں محمد سرور انجم، محمد لطیف اور عطاء الحق قاسمی بھی پڑھتے تھے۔ محمد سرور انجم کو فورٹ عباس کھا

گیا، محمد لطیف کا صرف ایک شعری مجموعہ ''حریمِ حرف'' شائع ہوا اور یہ فورٹ عباس، رحیم یار خان اور بہاول پور کے ہو کر رہ گئے۔ عطاء الحق قاسمی نے شاعری، ادبی صحافت، کالم نگاری، ڈراما نویسی، مزاح، سفرنامہ نویسی اور بے مثال سفارت کاری میں نام پیدا کیا۔ زمانہ گزر گیا تو بھی اورینٹل کالج کے دَر و دیوار عطاء الحق قاسمی کے قہقہوں اور امجد اسلام امجد کی نظموں کی سنجیدگی خاص طور پر اُن ستاروں یا آنسوؤں سے آباد و سرشار ہیں جو کسی کی موجودگی یا فراق میں گرے تھے۔ امجد اسلام امجد کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ اچھے شاعر ہیں، ڈراما نگار ہیں یا بہت اچھے انسان ہیں۔ ان کی مہربانی ہے کہ یہ رحیم یار خان، بہاول پور اور بہاول نگر میں آتے اور اپنے خطبوں یا شاعری سے نوازتے رہتے ہیں۔ امجد اسلام امجد نے سب سے پہلے اپنی ایک تازہ غزل ارشاد فرمائی:

کچھ وضاحت نہ التجا کیجیے — سچ کہا ہے تو حوصلہ کیجیے
ہم نے مانا کہ معتبر ہے دماغ — دل نہ مانے اگر تو کیا کیجیے
آپ بھی تو یہیں پہ رہتے ہیں — خود کو بھی وقت کچھ دیا کیجیے
کرنا چاہیں جو شہر کی تعمیر — اپنے ہی گھر سے ابتدا کیجیے
دل نہ دنیا سے ہار مانے کبھی — میرے حق میں یہی دُعا کیجیے
آئینے ٹوٹ کر نہیں جڑتے — دوستوں کو نہ یوں خفا کیجیے
لفظ سے بھی خراش پڑتی ہے — تبصرہ سوچ کر کیا کیجیے
جھوٹ سے بھی برا ہے آدھا سچ — اس سے بہتر ہے چپ رہا کیجیے

ایک اور چھوٹی سی نظم سناتا ہوں:

درد پھیل جائے تو ایک وقت آتا ہے
آرزو گزیدوں کے حوصلے نہیں چلتے

دشتِ بے یقینی میں آسرے نہیں چلتے
اک ذرا توجہ سے دیکھیے تو کھلتا ہے
لوگ ان پہ چلتے ہیں راستے نہیں چلتے
عشق کے علاقے میں حکم یار چلتا ہے
ضابطے نہیں چلتے
حسن کی عدالت میں عاجزی تو چلتی ہے
مرتبے نہیں چلتے
دوستی کے رشتوں کی پرورش ضروری ہے
سلسلے تعلق کے خود سے بن تو جاتے ہیں
لیکن ان شگوفوں کو ٹوٹنے بکھرنے سے
روکنا بھی پڑتا ہے
چاہتوں کی مٹی کو، آرزو کے پودے کو
سینچنا بھی پڑتا ہے
رنجشوں کی باتوں کو بھولنا بھی پڑتا ہے

ایک غزل:

ترے اِردگرد وہ شور تھا ، مری بات بیچ میں رہ گئی
نہ میں کہہ سکا ، نہ تو سن سکا ، مری بات بیچ میں رہ گئی
ترے شہر میں مرے ہم سفر ، وہ دکھوں کا جم غفیر تھا
مجھے راستہ نہیں مل سکا ، مری بات بیچ میں رہ گئی
تری کھڑکیوں پہ جھکے ہوئے ، کئی پھول تھے ہمیں دیکھتے
تری چھت پہ چاند ٹھہر گیا ، مری بات بیچ میں رہ گئی

مری زندگی میں جو لوگ تھے ، مرے آس پاس سے اُٹھ گئے
میں تو رہ گیا انھیں روکتا ، مری بات بیچ میں رہ گئی

''آخری شعر ہے اسی شعر کے لیے میں نے غزل کہی ہے۔'':

مجھے وہم تھا ترے سامنے ، نہیں کھل سکے گی زباں مری
سو حقیقتاً بھی وہی ہوا ، مری بات بیچ میں رہ گئی

پہلے ایک نظم جو میں کسی بھی تعلیمی ادارے میں جا کر پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں اگرچہ لکھی تو میں نے اپنے بیٹے کے نام تھی لیکن آپ نوجوان بچے بچیاں بھی میرے بیٹے بیٹیاں ہیں۔ سو یہ نظم پیش کرتا ہوں۔ (یہ نظم انسان کی چار نسلوں کی کہانی ہے):

مرے بیٹے نے آنکھیں اِک نئی دنیا میں کھولی ہیں
اسے وہ خواب کیسے دوں جنھیں تعبیر کرنے میں مری اک عمر گزری ہے
مری تعظیم کی خاطر وہ ان کو لے تو لے شاید
مگر جو زندگی اس کو ملی ہے اس کے دامن میں
ہمارے عہد کی قدریں تو کیا، یادیں بھی کم کم ہیں
انوکھے پھول ہیں اس کے، نرالے اس کے موسم ہیں
خود اپنی ذات کی مستی میں بہنا چاہتا ہے وہ
نئی دنیا، نئے منظر میں رہنا چاہتا ہے وہ
سمجھ میں کچھ نہیں آتا، اسے کیسے بتاؤں میں
ازل سے آج تک جتنے محبت کرنے والے ہیں
سبھی کی اک کہانی ہے
نئی لگتی تو ہے لیکن، حقیقت میں پرانی ہے
اسے کیسے بتاؤں میں کہ میرے باپ کی باتیں

مجھے بھی ایک ایسے وقت کا احوال لگتی تھیں
جو اک بھولا فسانہ تھا
نئے بازار تھے میرے، کرنسی اور تھی میری
وہ بستی، اور تھی میری
مگر پھر یہ کھلا مجھ پر نیا کچھ بھی نہیں شاید
ازل سے ایک منظر ہے فقط آنکھیں بدلتی ہیں
مری نظروں کا دھوکا تھا کہ یہ چیزیں بدلتی ہیں
اسے کیسے بتاؤں میں کہ یہ عرفان کا لمحہ
ابھی اس تک نہیں پہنچا
مگر جس وقت پہنچے گا اسے بھی اپنے بیٹے کو
یہی قصہ سنانے میں یہی دشواریاں ہوں گی
کہ وہ بھی تو کچھ اپنی بات کہنا چاہتا ہوگا
نئی دنیا، نئے منظر میں رہنا چاہتا ہوگا
اور اپنی ذات کی مستی میں بہنا چاہتا ہوگا

ایک چھوٹی سی نظم۔ نصیحت کچھ زیادہ ہوگئی ہے لہٰذا میں چھوٹی اور اچھی سی نظم پیش کرتا ہوں:

''بے وفائی کی شکلیں''

جو تم نے ٹھان ہی لی ہے ہمارے دل سے نکلو گے
تو اتنا جان لو پیارے سمندر سامنے ہوگا
اگر ساحل سے نکلو گے
ستارے جن کی آنکھوں نے ہمیں اک ساتھ دیکھا ہے

گواہی دینے آئیں گے
پرانے کاغذوں کی بالکونی سے
بہت سے لفظ جھانکیں گے
تمہیں واپس بلائیں گے
کئی وعدے فسادی قرض خواہوں کی طرح رستے میں روکیں گے
تمہیں دامن سے پکڑیں گے
تمہاری جان کھائیں گے
چھپا کر کس طرح چہرہ بھری محفل سے نکلو گے
ذرا پھر سوچ لو جاناں نکل تو جاؤ گے شاید
مگر مشکل سے نکلو گے

.....

''سیلف میڈ لوگوں کا المیہ''

روشنی مزاجوں کا کیا عجب مقدر ہے
زندگی کے رستے میں بچھنے والے کانٹوں کو
راہ سے ہٹانے میں
ایک ایک تنکے سے آشیاں بنانے میں
خوشبوئیں پکڑنے میں، گلستاں سجانے میں
عمر کاٹ دیتے ہیں
عمر کاٹ دیتے ہیں
اور اپنے حصے کے پھول بانٹ دیتے ہیں
یہ نہیں کہ ان کو اس روز و شب کی کاہش کا

کچھ صلہ نہیں ملتا
مرنے والی آسوں کا
خوں بہا نہیں ملتا
زندگی کے دامن میں جس قدر بھی خوشیاں ہیں
سب ہی ہاتھ آتی ہیں
سب ہی مل بھی جاتی ہیں
وقت پر نہیں آتیں، وقت پر نہیں ملتیں
یعنی ان کو محنت کا اجر مل تو جاتا ہے
لیکن اس طرح جیسے
قرض کی رقم کوئی
قسط قسط ہو جائے
اصل جو عبارت ہو، پس نوشت ہو جائے
فصلِ گل کے آخر میں پھول ان کے کھلتے ہیں
ان کے صحن میں سورج دیر سے نکلتے ہیں

مزید فرمائش پر انھوں نے فرمایا ''بس بیٹا بہت دیر ہوگئی ہے، آخری نظم سنا دیتا ہوں۔'' یونیورسٹی کے زمانے کی:

''اگر کبھی میری یاد آئے''

اگر کبھی میری یاد آئے
تو چاند راتوں کی نرم دل گیر روشنی میں
کسی ستارے کو دیکھ لینا
اگر وہ نخلِ فلک سے اُڑ کر تمہارے قدموں میں آ گرے تو

یہ جان لینا
وہ استعارہ تھا میرے دل کا
اگر نہ آئے
مگر یہ ممکن ہی کس طرح ہے
کہ تم کسی پر نگاہ ڈالو
تو اس کی دیوارِ جاں نہ ٹوٹے، وہ اپنی ہستی نہ بھول جائے
اگر کبھی میری یاد آئے
گریز کرتی ہوا کی لہروں پر ہاتھ رکھنا
میں خوشبوؤں میں تمہیں ملوں گا
مجھے گلابوں کی پتیوں میں تلاش کرنا، میں اوس قطروں کے آئنوں میں تمہیں ملوں گا
اگر ستاروں میں، اوس قطروں میں، خوشبوؤں میں نہ پاؤ مجھ کو
تو اپنے قدموں میں دیکھ لینا
میں گرد ہوتی مسافتوں میں تمہیں ملوں گا
کہیں پہ روشن چراغ دیکھو
تو جان لینا
کہ ہر پتنگے کے ساتھ میں بھی بکھر چکا ہوں
تم ایسا کرنا کہ ان پتنگوں کی خاک دریا میں ڈال دینا
میں خاک بن کر سمندروں میں سفر کروں گا
کسی نہ دیکھے ہوئے جزیرے پہ رک کے تم کو صدائیں دوں گا
سمندروں کے سفر پہ نکلو تو اس جزیرے پہ بھی اُترنا

یہ ۲۰۱۴ء کی ایک سرد شام کا ذکر ہے جب گھوٹوی ہال میں ''ڈاکٹر مختار سٹڈی سرکل'' کے زیرِ اہتمام ایک بہاول پوری ادیب کے ساتھ شام منائی جا رہی تھی کہ ایک

مقرر نے سیّد تابش الوری کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ تابش صاحب چالیس برس سے ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ بظاہر یہ ایک معمولی سی بات تھی لیکن چونکہ خلافِ واقعہ تھی لہٰذا ''ساظر'' نے مقرر کی تصحیح کی اور بتایا ''چالیس نہیں ساٹھ سال'' اس پر ہال میں بحث شروع ہوگئی۔ ایک سمت تابش صاحب کی عمر کم کر کے انھیں نسبتاً جوان دکھانے کا معاملہ درپیش تھا اور دوسری طرف اُن کی علمی و ادبی بزرگی کا۔ لہٰذا اس معاملے میں تابش صاحب بھی خاموش اور گومگو کا شکار تھے جب کہ ساظر کے پیشِ نظر ایک حوالہ تھا جس کی روشنی میں تابش صاحب کی ادبی زندگی کا تمام تر گوشوارہ مرتب کیا جاسکتا تھا۔ یہ تو ایک حقیقت تھی کہ تابش صاحب پر پہلا تحقیقی مقالہ ساظر ہی کی نگرانی میں لکھا گیا تھا۔ ساظر ہی تابش صاحب کو شعبۂ اُردو و اقبالیات میں بلاتا اور طالب علموں کو بتاتا کہ دیکھیں، اسے کہتے ہیں اچھی اور مزاحمتی شاعری لیکن یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ ساٹھ کی دہائی کے اوائل یعنی ''الزبیر'' سے پہلے سیّد تابش الوری، عالم علی عالم کے پاس سیّد شہاب دہلوی کے رسالے ''الہام'' بہاول پور کے لیے منظومات لینے کے لیے گئے اور تابش صاحب نے نظم دیکھتے ہی فرمایا کہ نظم موزوں نہیں ہے۔ عالم علی عالم کے پوچھنے پر تابش الوری نے نظم میں موجود ناموزونیت کی نشان دہی کی جس پر شاعر نے اپنی فوری اصلاح کی اور اپنی کتاب ''عالمِ نو'' میں اس واقعے کا ذکر اس طرح کیا جس سے تابش صاحب کا ''نوعمر لڑکا'' ہونا بھی ثابت ہوتا تھا اور بیس اکیس سال کی عمر میں کسی بزرگ کے اشعار کی اصلاح کی جرأت، اخلاقی بلندی اور فن پر گرفت کا اظہار بھی۔

''ساغر آتشیں''، ''رات، ہوا، چراغ'' اور ''سرکارِ دوعالمؐ'' کے بعد تابش الوری، خواجہ فرید کی کافیوں کا منظوم ترجمہ کر رہے ہیں۔ مختلف رسائل و اخبارات میں اُن کے قطعات بھی تواتر سے شائع ہو رہے ہیں جب کہ تابش الوری کے ڈرائنگ روم میں انگریزی مہینے کی ہر سولہ تاریخ کو ادبی نشست ہوتی ہے۔ اہلِ بہاول پور کی طرف سے

شاہ جی کو ''شانِ بہاول پور'' اور صدرِ پاکستان کی طرف سے ''تمغۂ امتیاز'' مل چکا ہے۔ سیّد تابش الوری نے اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے مائیک سنبھالا اور بطور صدر مشاعرہ و چیئرمین تقریبات مختصر سی گفتگو کی۔ انھوں نے فرمایا:

''محترم جناب پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب صاحب، محترم امجد اسلام امجد، شعرائے کرام، محترم شرکاء اور عزیز طلبہ و طالبات! رات تیزی سے ڈھل رہی ہے، دن بیت چکا ہے بلکہ تاریخ بھی بدل گئی ہے۔ مجھے آپ سب کو داد دینی ہے کہ آپ بڑی محبت، بڑی لگن، بڑے شوق اور بڑے صبر سے مشاعرہ سننے کے لیے ابھی تک بیٹھے ہیں۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ بھرپور تالیاں آپ کے لیے ہوں۔ آپ سب جانتے ہیں کہ شاعری کا سکہ سارے زمانے میں چلتا ہے مگر اُردو ادب کی یہ انفرادیت اور خصوصیت ہے کہ یہاں مشاعرے کی صورت میں کلام شاعر بہ زبان شاعر سننے کا موقع ملتا ہے۔ ہمارے ادب کی یہ خوب صورت روایت ہماری تاریخ و تہذیب، ہمارے شعر و ادب اور ہمارے فن و ثقافت میں پیوستہ ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور نے اس خوب صورت روایت کو آگے بڑھایا ہے اور ادبی و ثقافتی میلے اور آل پاکستان مشاعرے کا انعقاد کیا ہے جس سے بہاول پور میں ادب کی ایک نئی تاریخ رقم ہوئی ہے۔ مجھے اپنے شعرائے کرام کا بھی دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرنا ہے جو دور دراز سے ملک کے مختلف حصوں سے بہاول پور تشریف لائے اور ہمیں اپنے کلام سے نوازا اور طلبہ و طالبات سب سے زیادہ آپ کا شکریہ کہ جس جوش و خروش اور جس صبر و تحمل سے تمام شعراء کو سنا۔ اس سے یونیورسٹی اور بہاول پور کی آن، بان اور شان میں مزید اضافہ ہوگیا۔ میں آپ ہی کے نام دو قطعات کر رہا ہوں:

آئی۔ یو۔ بی کے چاند ستارو! روشنی پھیلاتے رہنا
ہر میدان میں فتح کا پرچم ہر سُو لہراتے رہنا

اُستادوں کی شفقت لے کر کوہِ عمل پر چڑھتے رہنا
ماں کی دُعاؤں کے سائے میں منزل منزل بڑھتے رہنا

☆☆☆☆

جذبوں کی رنگتوں سے تیرہ شبی مٹائیں
چاہت کی خوشبوؤں سے دل کے چمن کھلائیں
ہر ذہن کے اُفق پر یوں کہکشاں سجائیں
اک شمع تم جلاؤ ، اک شمع ہم جلائیں

☆☆☆☆

ہم نئے سورجوں کے شیدائی
برف کے سائبان رکھتے ہیں
بارشوں کی دُعائیں کرتے ہیں
اور کچے مکان رکھتے ہیں

☆☆☆☆

دھوپ سے بچ کے کس طرف جائیں
سائے خنجر چھپائے پھرتے ہیں
آئینہ بن کے کس طرح نکلیں
لوگ پتھر اُٹھائے پھرتے ہیں

☆☆☆☆

آئینہ بد لحاظ ہوتا ہے
یہ خوشامد سے بہرہ مند نہیں
ہم کو وہ بھی دکھائے جاتا ہے
جو ہمیں دیکھنا پسند نہیں

محبت کی ادائیں نت نئے انداز رکھتی ہیں
کبھی انعام دیتی ہیں ، کبھی انعام لیتی ہیں
میں جب بھی آزمائش کے سفر میں گرنے لگتا ہوں
مری ماں کی دُعائیں مجھ کو اکثر تھام لیتی ہیں

اک مبصر کا تبصرہ سن کر
ذہن ہر لحہ ارتعاش میں ہے
قوم اک ملک کی تلاش میں تھی
ملک اب قوم کی تلاش میں ہے

نوجوانوں کے لیے ایک غزل کے کچھ شعر:

ے ساری دنیا کی نگاہوں سے چھپا رکھا ہے
ہم نے ایک شخص کو آنکھوں میں بسا رکھا ہے
جو بھی آئے ، نئی خوشبو کی طرح آجائے
ہم نے دروازہ ہمیشہ ہی کھلا رکھا ہے
اس قدر معرکۂ زہرہ جمالاں کب تھا؟
دل نے طوفان پہ طوفان اُٹھا رکھا ہے
جانے کس سمت سے وہ رشکِ بہار آجائے
میں نے ہر راہ کو گلزار بنا رکھا ہے
فون پر روز ہی ہو جاتی ہیں لمبی باتیں
ایک پیغام ابھی میں نے بچا رکھا ہے

ایک اور غزل کی فرمائش ہے میں عرض کرتا ہوں:

ے اب کے عجب سفر پہ نکلنا پڑا مجھے
راہیں کسی کے نام تھیں ، چلنا پڑا مجھے

تاریک شب نے سارے ستارے بجھا دیئے
میں صبح کا چراغ تھا ، جلنا پڑا مجھے
راہوں کے پیچ و خم میں بلا کے طلسم تھے
چلنا بڑا محال تھا ، چلنا پڑا مجھے
ہر اہلِ انجمن کی ضرورت تھی روشنی
میں شمعِ انجمن تھا ، پگھلنا پڑا مجھے
ظالم بہت ہے شدتِ احساسِ آگہی
اکثر پرائی آگ میں جلنا پڑا مجھے''

صاحبِ صدر کی غزل میں مقطع نہیں تھا لیکن آخری شعر پڑھ کر تابش الوری، جو اس سے پہلے ذرا تن کر بیٹھے شعر سنا رہے تھے، کسی قدر ڈھیلے پڑے اور بڑی حد تک آسودہ ہو گئے تو نقیبِ مشاعرہ کو اندازہ ہو گیا اور انھوں نے بڑی رسان سے مشاعرے کے اختتام اور اگلے مرحلے کے آغاز کے لیے مائیک نئے نقیب آغا صدف مہدی کے سپرد کر دیا۔ انھوں نے مائیک سنبھالتے ہی اپنے اس اعزاز کا اظہار کیا کہ گیارہ مارچ کو ادبی و ثقافتی میلے کا آغاز بھی انھوں نے کیا تھا اور اب اس کی اختتامی تقریب یعنی شیلڈز اور نشانِ اعزاز کی تقسیم کا آغاز بھی انہی کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔ تبھی انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب وائس چانسلر اور تقریبات کے چیئرمین سیّد تابش الوری سٹیج پر سامنے کی سمت آئے اور موجود شعراء اور منتظمین میں اعزاز تقسیم کیے۔ آخری شیلڈ جناب وائس چانسلر نے جناب چیئرمین کو دی، شیلڈ کیا ہے؟ درحقیقت اس پر بہاول پور کو نمایاں کرنے والے تقریباً تمام نشان موجود ہیں اور اُن اداروں کے ''اِن سگنیا'' بھی جنھوں نے مختلف طریقوں سے اس میلے کو ممکن بنایا۔ نشانات میں پیلیکن اور تلور کے ساتھ ایک مینار ہے۔ انگریزی زبان میں ''Bahawalpur Literary and Cultural Festival

2020'' لکھا ہے جب کہ اس کے نیچے اُردو میں ''اُمیدِ بہار'' درج ہے۔ یہ اس میلے کا نشان ہے۔ اس کے علاوہ ''حکومت پنجاب، پی ایچ اے، بہاول پور چیمبر آف کامرس، ڈی ایچ اے، لکسن گروپ آف کمپنیز اور پریس کلب بہاول پور کے نام اور نشانات ہیں جب کہ اسلامیہ یونیورسٹی کا اِن سگنیا بھی بہت نمایاں ہے۔ اس کی دوسری سمت میں فیسٹیول اور یونیورسٹی کا نام درج ہے۔ اس اعزاز کے علاوہ آنے والے مہمانوں اور منتظمین کو انھیں اداروں کو ظاہر کرنے والا ''گلاواں'' بھی پہنایا گیا تھا۔ یہ دونوں چیزیں تاعمر ہر منتظم اور مہمان کے لیے یادگار بنی رہیں گی۔

اعزاز کی تقسیم اور جلسہ ختم ہوا لیکن جن کے سبب یہ سب کچھ ہوا، اُن کا کہیں ذکر ہی نہیں لیکن اگر ہم اس تحریر کا آغاز توجہ سے دیکھیں تو کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو اور ڈاکٹر آصف فرخی سے لے کر اسلامیہ یونیورسٹی کے ذکر تک ایک ہی شخصیت ہے جو کہیں ظاہر بھی نہیں ہوتی اور کہیں چھپتی بھی نہیں ہے۔ اس شخصیت کا اسمِ گرامی انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب ہے۔

اسلامیہ یونیورسٹی میں مولانا ابوبکر غزنوی سے پروفیسر ڈاکٹر قیصر مشتاق تک بہت سے وائس چانسلر تشریف لائے اور سب نے یونیورسٹی کی تعمیر و ترقی میں ہمہ گیر حصہ لیا لیکن ان میں ڈاکٹر قیصر مشتاق کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ بیک وقت دو یونیورسٹیوں یعنی اسلامیہ اور ویمن یونیورسٹی بہاول پور کے وائس چانسلر رہے۔ اسی طرح ڈاکٹر محمد مختار کو ایک ہی وقت میں تین یونیورسٹیوں کا وی سی بننے کا اعزاز حاصل ہے کہ اُن کے پاس غازی یونیورسٹی ڈیرہ غازی خان کا چارج بھی تھا لیکن ڈاکٹر اطہر محبوب کا اعزاز یہ ہے کہ انھیں مختلف وقتوں میں تین یونیورسٹیوں الصفہ یونیورسٹی کراچی، خواجہ فرید یونیورسٹی رحیم یار خان اور اب اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کا وائس چانسلر ہونے کا اعزاز حاصل ہے بلکہ میں کہوں گا کہ اسلامیہ یونیورسٹی کو یہ اعزاز حاصل ہوا ہے کہ انجینئر پروفیسر ڈاکٹر

اطہر محبوب اس کے وائس چانسلر ہیں۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اسلامیہ یونیورسٹی ڈاکٹر نصیر احمد ناصر سے ڈاکٹر قیصر مشتاق تک کسی نہ کسی خرخشے، جھگڑے، فساد، مار پیٹ، باہمی کشمکش اور اکھاڑ پچھاڑ کا شکار رہی ہے لیکن ۲۳ جولائی ۲۰۱۹ء سے اب تک یعنی گزشتہ ایک برس میں یونیورسٹی کے سب خرخشے مٹ گئے اور ہر شخص کو اُس کا استحقاق مل چکا ہے۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ اسلامیہ یونیورسٹی کے کسی وائس چانسلر، اُستاد یا ملازم کو اپنی عملی کارکردگی کے باعث دورانِ ملازمت تو کوئی تمغۂ کارکردگی ملا ہے لیکن انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب پہلے وائس چانسلر ہیں جو اسلامیہ یونیورسٹی کی باگ ڈور سنبھالنے سے پہلے اور بہاول پور میں بطور وی سی تشریف لانے سے پہلے ''تمغۂ امتیاز'' پا چکے تھے۔

یہ سب کچھ بجا لیکن ہم نے ڈاکٹر نصیر احمد ناصر اور پروفیسر قیوم قریشی مرحوم سے ڈاکٹر محمد مختار اور ڈاکٹر قیصر مشتاق تک کے زمانوں میں طلبہ و طالبات میں بے چینی پائی اور یونیورسٹی کے انتظام و انصرام کو تہہ و بالا ہوتے دیکھا ہے لیکن انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب نے طلبہ و طالبات کی گیارہ سوسائٹیاں بنا اور ہر سوسائٹی میں پندرہ، پندرہ ذہین و فطین اور متحرک اشخاص کو شامل کر کے طلباء، اساتذۂ کرام اور انتظامیہ کو اس طرح گھلا ملا دیا ہے کہ جیسے ہی کسی کو کوئی شکایت پیدا ہو، فوراً ہی اُس کا ازالہ ہو جائے کہ ان سوسائٹیوں میں طلبہ و طالبات کے علاوہ اساتذۂ کرام کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر گیارہ سوسائٹیوں کے صدور اور ایک سوسائٹی کی ذرا سی تفصیل ملاحظہ کیجیے:

۱۔ کریکٹر بلڈنگ سوسائٹی	زاہدہ خالد	صدر
۲۔ پرفارمنگ آرٹ سوسائٹی	نور العارفین	صدر
۳۔ قرأت اور نعت سوسائٹی	حافظہ عائشہ منیر	صدر
۴۔ پبلی کیشن سوسائٹی	غلام حسین	چیف ایڈیٹر

۵۔ فائن آرٹ سوسائٹی	محمد رضوان حیدر	صدر
۶۔ ڈیبیٹنگ سوسائٹی	نثار احمد	صدر
۷۔ سائنس سوسائٹی	محمد عاصم معصوم	صدر
۸۔ سپورٹس سوسائٹی	محمد عمیر ریاض	صدر
۹۔ میڈیا سوسائٹی	شہ زور اشرف	صدر
۱۰۔ انوائرمینٹل پروٹیکشن سوسائٹی	سیّدہ زینب اکبر	صدر
۱۱۔ لٹریری سوسائٹی	حفیظ نور رضا فیضی	صدر

اب ذرا گیارہویں سوسائٹی کی بُنت دیکھیے:

سینئر نائب صدر: نوال مہدی (بی ایس)، شعبۂ فزکس

سینئر نائب صدر۔I: فلزہ رفیق (بی ایس)، شعبۂ انگریزی

سینئر نائب صدر۔II: صبا نواز ندیم (بی ایس)، شعبۂ عملی نفسیات

جنرل سیکرٹری: عمارہ انجم (بی ایس)، شعبۂ انگریزی

جوائنٹ سیکرٹری۔I: محمد کاشف (بی ایس)، شعبۂ میڈیا سٹڈیز

جوائنٹ سیکرٹری۔II: طیبہ نورین (بی ایس)، شعبۂ کیمسٹری

پریس سیکرٹری: طارق عزیز (ایم۔اے) شعبۂ اُردو و اقبالیات

فنانس سیکرٹری: محمد احمد سعید (بی ایس آنرز)، شعبۂ مینجمنٹ سائنس

ایگزیکٹو ممبر: عائشہ فاروق (بی ایس)، شعبۂ کیمسٹری

ایگزیکٹو ممبر: عائشہ اریج اختر (بی ایس)، شعبۂ عملی نفسیات

ایگزیکٹو ممبر: سیّدہ عروج فاطمہ (بی ایس)، شعبۂ بائیو کیمسٹری

ایگزیکٹو ممبر: حافظ محمد مہتاب (بی ایس)، شعبۂ انگریزی

ایگزیکٹو ممبر: رابعہ خان (بی ایس)، شعبۂ انگریزی

ان پندرہ طلبہ وطالبات کی رہنمائی کے لیے اس سوسائٹی کی ایڈوائزر ڈاکٹر مسرت واجد جب کہ کو۔ایڈوائزر ڈاکٹر محمد شاکر، مسٹر ذیشان تبسم اور مسٹر حامد نواز ہیں اور تمام سوسائٹیوں کی ترتیب و تنظیم کی ذمہ داری پروفیسر ڈاکٹر تنویر حسین ترابی کے سپرد ہے جو اسلامیہ یونیورسٹی کے علاوہ دیگر یونیورسٹیوں کا بھی وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔

ایسی ترتیب و تنظیم کی موجودگی میں بڑے سے بڑے ادارے کو انتہائی آسانی کے ساتھ چلایا اور پیشِ نظر مقاصد حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ یہ محض اتفاق ہے کہ سب سے پہلے یہ تجربہ شعبۂ اُردو و اقبالیات میں مجلسِ اقبال کی صورت میں کیا گیا تھا جس کے نتائج بہت خوش گوار نکلے تھے۔

اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں ہمیشہ نئے پن کا اظہار ہوتا رہا ہے لیکن نئے پن کے ساتھ کچھ قباحتیں بھی ہوتی ہیں جن پر منتظمین بروقت توجہ کرلیا کریں تو معاملات کو مزید بہتر کیا جاسکتا ہے۔مثال کے طور پر بہاول پور کے تمام پوسٹ گریجوایٹ کالجوں کو فیسٹیول میں شریک کیا جاسکتا ہے۔اس کے علاوہ ویمن یونیورسٹی بہاول پور، خواجہ فرید یونیورسٹی رحیم یار خان اور چولستان یونیورسٹی کے طلبہ وطالبات کو بھی مختلف مقابلوں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔دو تین معروف شعراء کے علاوہ مشاعرے میں زیادہ تر بہاول پوری شعراء کو موقع ملنا چاہیے۔ایسے شعراء سے بچنا چاہیے جو سیاسی بخار میں مبتلا ہوں اور اُن کی دلچسپی واضح طور پر ملک کی سیاسی جماعتوں سے ہو۔سٹیٹ اور حکومت کے خلاف کہی گئی منظومات کو بھی سنسر ہونا چاہیے۔شعراء کرام سے درخواست کی جانی چاہیے کہ وہ اپنا مختصر کوائف نامہ اور تازہ کلام تحریری طور پر بھی عطا کریں تاکہ اشاعت کے مرحلے میں دقت نہ ہو۔ہر شاعر اپنی دو تین غزلوں یا نظموں سے زیادہ عطا نہ کرے اس کے علاوہ نام نہاد مزاحیہ کلام کی بہتات سے تربیت کی بجائے بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔

آخر میں ہم اہلِ بہاول پور کی طرف سے یہ گزارش ہے کہ ''ثقافتی وادبی فیسٹیول''

بہت کامیاب قدم تھا جو تمام اہلِ بہاول پور کے لیے ذہنی و اخلاقی تربیت کے علاوہ بہترین تفریح کا سبب بھی بنا رہا۔اس کے لیے ہم سب تمام اداروں بطورِ خاص انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب کو ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے آئندہ برسوں میں اسے مزید شان دار بنانے کی درخواست کرتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ ادبی و ثقافتی فیسٹیول ۲۰۲۱ء تک کرونا ختم ہو جائے گا اور شہری تحصیلی، ضلعی اور ڈویژنل حکومت بھی فیسٹیول میں بہ نفسِ نفیس شامل رہے گی۔ان شاءاللہ۔

☆☆☆ تمت بالخیر ☆☆☆